سخنِ معتبر
ناطق مالوی

مسکین مظہر علی خان

اہلِ ادب باذوق احباب
کے لیے تحفہ پڑھنیے
اور دعاؤں میں یاد
رکھیے

Misken Mazhar ali
Khan

مجھے تراش کے رکھ لو کہ آنے والا وقت

خزف دکھا کے گُہر کی مثال پوچھے گا

فضا ابنِ فیضی ✍️

ناطق مالوی

مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال

ناطق مالوی مرحوم

پیش لفظ

اردو ہندوستان کی زبانوں میں ایک بہت اہم اور طاقت ور زبان ہے جو اپنے لب و لہجے کی تونگری اور شیرینی کے باعث ہر دلعزیز اور مقبولِ عام ہے اس زبان کی اپنی ایک تہذیب اور اپنی ایک عظیم الشان روایت اس ملک کے طول و عرض میں رہی ہے۔

ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرح مرکزی اور ریاستی حکومتیں اردو کی ترقی و ترویج کے لیے بھی کوشاں ہیں اور اپنے اپنے دائرۂ کار اور وسائل کے مطابق عمل کر رہی ہیں۔ اس زبان کی ہمہ گیر ترقی کے لیے ان ریاستوں میں جہاں اردو بولنے اور پڑھنے والوں کی معقول تعداد ہے اردو اکادیمیاں قائم کی گئی ہیں۔ مدھیہ پردیش بھی ان ریاستوں میں شامل ہے جہاں باقاعدہ ریاستی اردو اکادیمیاں برسرِ عمل ہیں۔

اردو زبان و ادب کی ہمہ جہتی و ترقی کے علاوہ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے مقاصد میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس صوبے کے ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور دیگر مصنّفوں کی کتابیں بہ اہتمام شائع ہو کر منظرِ عام پر آئیں۔ اس امر کے لیے اکادمی مصنّفوں کی دو طرح معاونت کرتی ہے اوّل یہ کہ وہ ادیب جو اپنی تصانیف کی خود اشاعت کرنا چاہتے ہیں انہیں معقول مالی تعاون دیتی ہے، دوسرے یہ کہ اکادمی کتابوں کی اشاعت کا خود بھی منصوبہ رکھتی ہے جس کے تحت صوبے کے مصنفوں کی کتابیں اکادمی کی طرف سے شائع کی جاتی ہیں۔ ان دونوں امور کا فیصلہ ماہرین پر مشتمل کمیٹی کی رائے کے مطابق کیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب اکادمی کے اپنے اشاعتی منصوبے کا ایک حصّہ ہے ہمیں اُمید ہے کہ اُردو حلقوں میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

فضل تابش
سکریٹری مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال

انتساب

سرونج اور سرونج کے اُن صاحبِ نظر حضرات کی

نذر

جو ایک مدّت سے اپنے

آفتاب کو جلوہ بار دیکھنے کے

آرزومند ہیں!

ترتیب و تہذیب

شاہد میر

نعت

نالہ کش صحنِ چمن زار میں آتا ہوں میں
شعلہ افشانیٔ گفتار میں آتا ہوں میں

پھونک ڈالا تپشِ افروزیٔ دوراں نے مجھے
سایۂ ابرِ گہر بار میں آتا ہوں میں

آہ مظلوم ہوں فریاد جگر تفتہ ہوں
داورِ داد کی سرکار میں آتا ہوں میں

محفلِ رندِ خرابات سے ہو کر بیزار
بزمِ خاصانِ خوش اطوار میں آتا ہوں میں

کرمِ خاص کی اُمید لیے ہوں دل میں
کرمِ عام کے دربار میں آتا ہوں میں

قدسیو پردے اٹھا دو حرمِ اقدس کے
بارگاہِ شہِ ابرار میں آتا ہوں میں

دولتِ دیدۂ بیدار عطا ہو مجھ کو
حسرتِ دیدۂ بیدار میں آتا ہوں میں

سیّدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوے تو (ناطق) پئے درماں طلبی

کچھ لوگ خوش آواز ہوا کرتے ہیں
کچھ کہنے کے انداز ہوا کرتے ہیں
یہ وصف نہیں جن میں. وہ ناطقؔ کی طرح
اک نغمۂ بے ساز ہوا کرتے ہیں

ناطقؔ مالوی

غزلیں

ایک مجبور تہِ دامِ بلا کیا کرتا
نہ تڑپتا تو تڑپنے کے سوا کیا کرتا

غیر پابندیٔ آئینِ وفا کیا کرتا
میری تقلید کوئی میرے سوا کیا کرتا

چارہ گر کو مرے احباب نہ بدنام کریں
لادوا درد کی بے چارہ دوا کیا کرتا

جس پہ قابو نہ ہو اس بات کا شکوہ بے سود
نالہ نالہ ہی تو تھا حشر بپا کیا کرتا

مسکراتے ہوئے وہ جام بڑھانا اُن کا
کوئی انکار کا پہلو ہی نہ تھا، کیا کرتا

موجِ گرداب سے کشتی کو بچالے جانا
کارِ ممکن تھا مگر حکمِ خدا کیا کرتا

منتِ غیر نہ تھا شیوۂ ناطق لیکن
ناموافق تھی زمانے کی ہوا کیا کرتا

ہم نے جب ظُلمتوں کے سہارے لیے
ظُلمتیں آگئیں چاند تارے لیے

آؤ، سوچیں کسی کُنج میں بیٹھ کر
کچھ تمہارے لیے کچھ ہمارے لیے

تم سے شکوہ کریں بھی تو کس بات کا
کیا نہ کہتے رہے تم ہمارے لیے

بادہ نوشو اُٹھو خم بہ رستو چلو
وہ گھٹائیں اُٹھیں کچھ اشارے لیے

دن کو اِک شعلۂ آتشیں ہی ملا
رات نے گود بھر کے ستارے لیے

دینے والے نے جو دے دیا لے لیا
اب وہ شعلے لیے یا شرارے لیے

کچھ اسی میں ہے شانِ سلامت روی
ناخداؤں سے کہہ دو کنارے لیے

چل پڑے تو کسی کے نہ روکے رُکے
تھک گئے تو لحد کے کنارے لیے

رات دن مغموم رہنا بھی دلِ ناکام کیا
صبحِ نو کے آرزومندوں کو فکرِ شام کیا

عشق آوارہ سرشت و حسن رسوائی بدوش
دیکھئے دیتی ہے اب دُنیا کسے الزام کیا

بے مُروّت، بے وفا، کہنے پہ یہ خفگی ہے کیوں؟
بے مُروّت، بے وفا بھی ہیں تمہارے نام کیا

آ کے بیٹھے ہیں تو حشرِ آرزو بھی دیکھ لیں
آپ کی محفل سے جائیں اُٹھ کے اب ناکام کیا

آج ہی مایوسیوں کا اس قدر کیوں ہے ہجوم
پھر نہ آئے گی شبِ غم پھر نہ ہو گی شام کیا

چارہ گر سُنتا ہے کیا رہ رہ کے دل کی دھڑکنیں
دل ہی دل میں بھی نہ لے کوئی کسی کا نام کیا

صبح عشرت راس آئی اور نہ شام انبساط
ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں صبح و شام کیا

ساری دنیا میں تو رسوائے محبت کر دیا
چاہتی ہے اور سعئ رائگاں انجام کیا

میری پروازِ نظر کے سامنے سب ہیچ ہیں
طائرِ سدرہ نشیں کیا مرغِ زیرِ دام کیا

بندہ پرور ایک ادنیٰ سی توجہ کے لیے
عمر بھر تڑپا کرے گا ناطقؔ ناکام کیا

اے دوست میں نے شکوۂ دوراں کیا تو ہے
یہ بھی تری نظر میں ہے کوئی خطا تو ہے

وہ باوفا نہیں ہے، نہ ہو، بے وفا تو ہے
دنیا میں اپنا کوئی نظر آشنا تو ہے

ظلمت نصیب دیکھئے پاتے ہیں کیا فروغ
شامانِ مہر و ماہ زمانہ ہوا تو ہے

یہ اور بات ہے کہ نہ آئے زبان پر
سینے میں ایک حشرِ تمنا بپا تو ہے

کچھ قدردانِ حسن بھی، گلشن کو کر عطا
پھولوں کو رنگِ عارضِ خوباں دیا تو ہے

مانا کہ سجدہ غیرِ خدا کفر ہے مگر
پروردگار شیوۂ اہلِ وفا تو ہے

ایسا نہ ہو کہ دیکھ کے منہ پھیر لے کوئی
او نامرادِ شوق تماشا بنا تو ہے

یہ شوخئ بیاں، یہ بیانِ رموزِ عشق
ناطقؔ تمہارا دل بھی کہیں مبتلا تو ہے

کہیں شعلہ کہیں شبنم کہیں برق و شرر ہو کر
تمہیں تم سامنے آئے ہو ہم گزرے جدھر ہو کر

تعجب ہے حریم دیر و کعبہ تیرے گھر ہو کر
مری راہوں میں حائل ہو گئے دیوار و در ہو کر

ہمیں بھی فخر ہے یہ، ہم بھی گزرے ہیں جدھر ہو کر
بہاروں نے قدم چومے ہیں فرش رہ گذر ہو کر

ذرا اُن کی طرف بھی دیکھ دزدیدہ نگاہوں سے
تری محفل میں جو بیٹھے ہیں سرتاپا نظر ہو کر

طلب اُس کی زہے طاعت تلاش اس کی زہے ہمت
مگر کچھ بے غرض رہ کر مگر کچھ بے خبر ہو کر

قفس میں تو خوش و ناخوش گزار آیا خداوندا
گلستاں میں رہوں گا کس طرح بے بال و پر ہو کر

ہمارا بھی سلامِ شوق کہہ دینا بیابانوں
کوئی گم گشتۂ منزل اگر گزرے اِدھر ہو کر

تمہیں یہ عشرتیں یہ عیش سامانی مبارک ہو
ہماری بھی گزر ہی جائے گی شام و سحر ہو کر

یہ کہہ کر زائرِ کعبہ کو بت خانے بُلاتے ہیں
اِدھر ہو کر ارے آوارۂ منزل اِدھر ہو کر

ترے کوچے کا ذرہ ذرہ اب تک سر بہ سجدہ ہے
نہیں معلوم ایسا کون گزرا تھا اِدھر ہو کر

خلش ہائے نگاہِ ناز کی کیا بات ہے ناطقؔ
مگر وہ اِک خلش جو رہ گئی دردِ جگر ہو کر

دردِ دل کی لذّتوں سے دل ہے سرشارِ وفا
منکشف ہونے لگے اب ہم پہ اسرارِ وفا

جانِ مجروحِ تمنّا دل پرستارِ وفا
اور اب کیا چاہتا ہے سینہ افگارِ وفا

تم ادا و ناز و نخوت سے جفا کا کام لو
میری خاموشی بہت ہے بہرِ اظہارِ وفا

ہر قدم پر ٹھوکریں ہیں ہر قدم پر لغزشیں
دیکھئے کس طرح طے ہو راہ دشوارِ وفا

اُن کی نظروں سے نہیں معلوم پھر کیوں گر گئے
اس قدر تو ہم نہ تھے شاید سبکسارِ وفا

آتشِ سوزِ دروں سے پھُنک گئے اور اُف نہ کی
نازشِ دوراں تھے وہ شائستہ اطوارِ وفا

یا ہمیں کو باوفا کہتے ہوئے آتی ہے شرم
یا ہمیں ہم سے تھے کبھی آئینہ بردارِ وفا

اس توقع پر تو ہم برسوں جئیں گے چارہ گر
جان لیوا ہے تو کیا ہے، ہے تو آزارِ وفا

آج کیا ہے روزِ محشر پیشِ داور دیکھنا
میرا اظہارِ حقیقت میرا پندارِ وفا

ناطقؔ ناشاد کی بھی کچھ خبر ہے دوستو
جانے کس عالم میں ہے وہ اب گرفتارِ وفا

تمہیں اپنوں نے سمجھا ہے نہ بیگانے سمجھتے ہیں
سمجھتے ہیں تو کچھ ہم جیسے دیوانے سمجھتے ہیں

تری محفل کا ہر پیمانہ پیمانہ سہی لیکن
جو ہم تک آئیں ہم تو اُن کو پیمانے سمجھتے ہیں

غمِ جاناں لیے بیٹھے ہیں آغوشِ تصوّر میں
غمِ دوراں کو اب کیا چیز دیوانے سمجھتے ہیں

نہیں معلوم یہ خوش فہمیاں کس روز جائیں گی
ابھی تک لوگ میخانوں کو میخانے سمجھتے ہیں

بقیدِ ہوش رہ کر بھی جنہیں جینا نہیں آتا
خدا کی شان ہے وہ ہم کو دیوانے سمجھتے ہیں

سرِ محفل چھلک پڑتے ہیں میری تشنہ کامی پر
جسے ساقی نہ سمجھا اس کو پیمانے سمجھتے ہیں

غرورِ حسن نازِ دلبری کو کوئی کیا جانے
یہ اُن کی بات ہے یہ اُنکے دیوانے سمجھتے ہیں

گدازِ عشق کے ہی صرف دلدادہ نہیں ناطق
گدازِ عشق کی قیمت بھی پروانے سمجھتے ہیں

درگزر مدِّنظر ہے چرخِ بے بنیاد کی
ورنہ صرف اِک آہ کافی تھی دلِ ناشاد کی

ضبطِ غم تو کرچکا تھا کام ہی اپنا مگر
وہ تو کہئے کچھ بنائیں ہل گئیں فریاد کی

تم سے ربطِ عشق قائم کر کے دل میں شاد ہوں
اور یہ بھی سوچتا ہوں زندگی برباد کی

ہوشیار اے آسماں اے دشمنِ صبر و قرار
آج کچھ بدلی ہوئی ہے لے مری فریاد کی

دوستو ناطق کہاں ہے اور کس عالم میں ہے
کچھ خبر بھی ہے تمہیں اُس خانماں برباد کی

نظامِ دہر بھی کیا کروٹیں بدلتا ہے
اِک آفتاب نکلتا ہے ایک ڈھلتا ہے

قفس میں چاہیں گے جس روز کھینچ لائیں گے
ابھی بہاروں پہ اتنا تو زور چلتا ہے

پناہِ صبر و تحمّل بھی آخرش کب تک
ہزار رنگ غمِ زندگی بدلتا ہے

بُرا تو کچھ نہیں میعارِ عقل و ہوش مگر
ذرا مزاجِ محبت سے ہٹ کے چلتا ہے

خزاں پرستوں کو حاصل کہاں نشاط و فراغ
یہ قافلہ تو بہاروں کے ساتھ چلتا ہے

دیارِ حسن میں آہ و فغاں کا نام نہ لو
یہاں لطیف اشاروں سے کام چلتا ہے

وہ رندِ مست نظر ہوں کہ میرے ساغر میں
شراب بن کے غمِ روزگار ڈھلتا ہے

وہ کیوں شریکِ غمِ عشق ہوں ترے ناطقؔ
پرائی آگ میں دیوانے کون جلتا ہے

شرر و شعلہ ملے چاند ستارے نہ ملے
زندگی پائی تو جینے کے سہارے نہ ملے

جاتے ہیں شیخِ حرم آپ کے کعبے کو سلام
یہاں پہچاننے والے ہی ہمارے نہ ملے

دینے والے کے تو قربان مگر کیا کہئے
جیسی نظریں مجھے بخشی تھیں نظارے نہ ملے

بادہ نوشی تو کجا جام چھوا ہو تو حرام
ہم کو جب تک تری رحمت کے اشارے نہ ملے

بخت یاور ہو تو اُٹھ جاتی ہے ہر قیدِ محال
اور مقدر نہ ہو ناطق تو پکارے نہ ملے

رندوں پہ بھی اب گردشِ دوراں کی نظر ہے
لانا، مرا ٹوٹا ہوا پیمانہ کدھر ہے

تم بھی یہی کہتے ہو کہ کیوں خاک بسر ہے
کچھ اپنے کرم اپنے ستم پر بھی نظر ہے

سجدوں پہ بھروسہ ہے نہ طاعت پہ نظر ہے
بخشش کا سہارا تو مرا دامنِ تر ہے

اِک پرتوِ ظلمت کے سوا کچھ نہیں دنیا
کہنے کے لیے جلوہ گہہ شمس و قمر ہے

چاہوں تو چمن زار کو شعلوں میں بدل دوں
لیکن ابھی تزئینِ گلستاں پہ نظر ہے

ارشاد ہوا ہے کہ زبانوں پہ نہ آئے
وہ راز کہ جس راز کی دنیا کو خبر ہے

میں جرعہ کشِ بادۂ تسنیم ہوں ناطقؔ
کوثر مرا خم خانہ ہے جنّت مرا گھر ہے

شگفتگی حیات کی غمِ حیات ہوگئی
سحر بدوش زندگی سیاہ رات ہوگئی

نگاہِ عشق جب شریکِ حسنِ ذات ہوگئی
فلک جناب بن گئی مَلک صفات ہوگئی

وہ اِک صدائے دل نشیں کہ لفظ کن کہیں جسے
اُٹھی جو وسعتیں لیے تو کائنات ہوگئی

ملی تھی جس کی خاک سے جبیں کو رونقِ حیات
وہ سجدہ گاہ مرکزِ توہمات ہوگئی

بلاکشانِ شامِ غم کی زندگی نہ پوچھئے
گھٹی تو زلف رہ گئی بڑھی تو رات ہوگئی

اِدھر ذرا نظر اٹھی اُدھر وہ مسکرادئے
نگاہ ہی نگاہ میں دلوں کی بات ہوگئی

پاکر مزاجِ یار کچھ اپنی طرف جھکا ہوا
میں نے کہا زہے نصیب، دل نے کہا بُرا ہوا

نقشِ سجود تو کہاں ناصیۂ نیاز میں
ایک نشان رہ گیا داغِ سیہ بنا ہوا

آپ کا دورِ عافیت اور یہ تباہ کاریاں
کام کسی کا بھی سہی نام تو آپ کا ہوا

ہم کہ صنم پرست تھے سیکڑوں بت بنالیے
شیخ نے ایک میکدہ ڈھا بھی دیا تو کیا ہوا

تجھ کو تو ہوگی کچھ خبر رہ روِ راہِ جستجو
یہ تو بتا کہ ناقۂ آبلہ پا کو کیا ہوا

دنیا کو چاہتا ہوں وفادار دیکھنا
یارو مری نگاہ کا معیار دیکھنا

اُن کی حریم ناز کے پردے نہ جل اٹھیں
اے آہِ شعلہ بار خبردار دیکھنا

اک دل ہے اور ہجوم صد آلام و آرزو
گھبرا نہ جائے آپ کا بیمار دیکھنا

آنکھیں بھی نشہ ریز نگاہیں بھی مست مست
کیف و خمارِ بادہ سرشار دیکھنا

آمرزگار تیرے کرم سے تو دور تھا
مجھ کو ہلاکِ ورطۂ آزار دیکھنا

آئینہ رکھ کے دیکھ کہ ہو تجھ پہ آشکار
ہم بندگانِ جبر کا مختار دیکھنا

پھولوں میں تُل رہے ہیں سرِ شاخ آشیاں
کیا اوج پر ہے طالعِ بیدار دیکھنا

ناطقؔ کسی کے گھر میں بہار آئے یا خزاں
ہم کو تو اپنے ہی در و دیوار دیکھنا

درِ پیرِ مغاں پہ گھر کے ابرِ تیرہ فام آیا
پیامِ زندگی تھا زندہ دل لوگوں کے نام آیا

کہاں کی توبہ اب تو ترکِ توبہ کا مقام آیا
اُدھر فصلِ بہار آئی اِدھر ہاتھوں میں جام آیا

نہ موجِ بوئے گل آئی نہ بوئے موجِ مے آئی
تری محفل سے کب ہم تک کوئی تیرا پیام آیا

جنوں پہنچا، نہ عقل و ہوش پہنچے تیری منزل تک
وہیں سب رہ گئے تھک کر جہاں جس کا مقام آیا

مری رودادِ غم کس شوق سے سنتی رہی دنیا
جہاں تک اُن کا ذکر آیا جہاں تک ان کا نام آیا

بظاہر کچھ نہیں تھا پھر بھی بزمِ ناز سے اُنکی
صدائے نامراد اُٹھی زمانہ تشنہ کام آیا

ہمارے دل میں ناطقؔ جو بھی آیا ہم تو کہہ گزرے
زباں پر اُن کی جب تک ایک عذرِ ناتمام آیا

شانِ نیازِ عشق دکھاتے چلے گئے
ہم بُتکدوں کو کعبہ بناتے چلے گئے

دیتا ہے کون بادۂ سرجوش بے طلب
اُن کا کرم کہ جام بڑھاتے چلے گئے

میں جلوہ جلوہ کچھ اُنہیں پہچانتا گیا
وہ پردہ پردہ سامنے آتے چلے گئے

وہ تابشِ جمال کہ اللہ کی پناہ
ذرّوں کو آفتاب بناتے چلے گئے

اہلِ وفا کی سادہ مزاجی معاف کر
نادان تھے فریب میں آتے چلے گئے

ناطق کو بزمِ غیر میں افسردہ دیکھ کر
کچھ ہنستے کچھ نگاہ چُراتے چلے گئے

ابر آئے اور شراب نہ برسی بہار میں
کیا نقص رہ گیا طلبِ بادہ خوار میں

ہر پھول خار ہے نگہِ اعتبار میں
اب کیا رکھا ہے دامنِ فصلِ بہار میں

اک ایسی صبح جس کی کوئی شام ہی نہیں
تشکیل پا رہی ہے شبِ انتظار میں

خوں ہو کے بہہ نہ جائے کہیں گلشن نمود
توبہ تو کی ہے بادہ کشوں نے بہار میں

اک سیلِ اضطراب ہے سینے میں موجزن
دل ہو تو کوئی دل کو رکھے اختیار میں

وعدے کے ساتھ ساتھ ذرا مسکرا تو دو
اک گرہ اور کشمکشِ انتظار میں

ناطقؔ ذرا یہ جبرِ مشیّت تو دیکھئے
سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں اختیار میں

آج کچھ اہلِ غرض جس کو وفا کہتے ہیں
آپ اس پستیٔ کردار کو کیا کہتے ہیں

نفسِ سرد کو جو آہِ رسا کہتے ہیں
ایسے دیوانوں کو کیا کہتے ہو کیا کہتے ہیں

تیری دزدیدہ نگاہی، تری قاتل نظری
تیر و نشتر ہے مگر ناز و ادا کہتے ہیں

بندۂ شوق و تجسّس ہیں، ہمیں کیا معلوم
کون رہزن ہے جسے راہ نما کہتے ہیں

کبھی آہیں کبھی آنسو کبھی ٹھنڈی سانسیں
کیا انہی باتوں کو تسلیم و رضا کہتے ہیں

ضبط فریاد مری لاج ترے ہاتھ ہے اب
مجھ کو کچھ لوگ پرستارِ وفا کہتے ہیں

سادہ دل حضرتِ ناطق سا کوئی کیا ہوگا
خود بداندیش ہیں دنیا کو بُرا کہتے ہیں

کبھی کبھی تم سے تنگ آ کر کبھی کبھی خود سے تنگ ہو کر
کچھ ایسا سوچا ہے ہم نے اکثر سنو تو رہ جاؤ دنگ ہو کر

ابھی جو کچھ کچھ جھکی ہوئی ہے ابھی جو کچھ کچھ رُکی ہوئی ہے
دلوں کی باتیں کرے گی اِک دن یہی نظر شوخ و شنگ ہو کر

ہزار عالم کی وسعتیں بھی نثار ہیں اُس غریب دل پر
گزار دی جس نے میرے پہلو میں ایک دنیائے تنگ ہو کر

تمہارے جلووں کی تابشوں نے خبر ہے کیا قہر ڈھا رکھا ہے
زمیں پہ نیرنگِ دہر بن کر فلک پہ آفاق رنگ ہو کر

نہ دلبری ہے نہ دل نوازی نہ فکرِ درماں نہ چارہ سازی
یہی نوازش رہی تو اِک دن رہے گی اب اُن سے جنگ ہو کر

اِک ایسا عالم بھی دورِ غربت میں ہم پہ ناطق گزر چکا ہے
کہ راہ کے پائمال کانٹے چُبھے ہیں دل میں خدنگ ہو کر

ہیں شکوہ سنجِ چرخِ ستمگر نہیں تو کیا
دل سے خدا خبر ہے زباں پر نہیں تو کیا

کل تھا تو کیا تھا آج میسّر نہیں تو کیا
صحرا نشیں ہوں بالش و بستر نہیں تو کیا

اِس چشمِ سرمگیں کو سلامت رکھے خدُا
ہاتھوں میں تیرے دشنہ و خنجر نہیں تو کیا

دامن بچا بچا کے گزُرتے ہو کس لیے
ہم گردِ راہ سے کے بھی برابر نہیں تو کیا

دل میں تو ہے چراغِ محبّت کی روشنی
داغِ سیاہ لوحِ جبیں پر نہیں تو کیا

ہم آرزوے لطف و کرم لے کے آئے تھے
وہ بھی ترے حضور میسّر نہیں تو کیا

کچھ شوخیٔ بیاں ہے تو کچھ شوخ سادگی
ناطق کے شعر قندِ مکرّر نہیں تو کیا

دردِ دل ہے آج کچھ ٹھہرا ہوا
چارہ سازِ بے کساں یہ کیا ہوا

ہم کو اپنی یاد اب آتی ہے یوں !
جیسے کوئی خواب ہو بھولا ہوا

کہتے کہتے رُک گیا کیوں نامہ بر
ہاں خدا کے واسطے پھر کیا ہوا

دیر تک کیا جانے کیا سوچا کیے
میرا دامن دیکھ کر پھیلا ہوا

بر سرِ شکِ دیدۂ خوں ہائے ناز
ایک دریا ہے مگر ٹھہرا ہوا

پھر چلے شہرِ نگاراں کی طرف
حضرتِ ناطق کو پھر یہ کیا ہوا

جفا پر جان قُرباں دشمنی پر دل نثار اپنا
زمانہ کیوں ہنسے، ہم پر شعور اپنا شعار اپنا

رُخِ روشن سے خود پردہ اُٹھا دے پردہ دار اپنا
کرشمہ کچھ دکھا اے حسرتِ دیدارِ یار اپنا

نہ اُن کی بزم . بزم اپنی نہ اُن کا پیار پیار اپنا
کہاں لے کر چلا ہے جذبۂ بے اختیار اپنا

غمِ جاناں لیے گزرے تھے جن راہوں سے دیوانے
اُنہیں راہوں پہ سایہ ڈالتی آئی بہار اپنا

مجھے عذرِ خطا پر کس لیے مجبور کرتی ہے
بہانہ ڈھونڈ لے خود رحمتِ پروردگار اپنا

زمانہ خود قدم چومے گا ناطقؔ ایک دن تیرے
ذرا قائم تو رکھ اپنی نگاہوں میں وقار اپنا

شفق کو ظلمت کدہ بنا دو سحر کو ہم رنگِ شام کر دو
ہمیں کو احساسِ غم نہیں ورنہ تم تو جینا حرام کر دو

نفس نفس میں گداز بھر دو نظر نظر کو پیام کر دو
مرے مذاقِ وفا پرستی کو ساری دنیا میں عام کر دو

حرم کے پاکیزہ ذوق لوگو تمہاری باتوں کا کیا ٹھکانہ
شباب کو تم جنوں بتا دو شراب کو تم حرام کر دو

دیارِ جاناں پہ رنگ و رامش کے ابر گھر گھر کے آ رہے ہیں
چراغِ مہرِ فلک بجھا دو بہشت زاروں میں شام کر دو

خرد کا ارشاد ہے کہ اِک اِک قدم اٹھاؤ سنبھل سنبھل کر
جنوں کا کہنا ہے ہر ارادے کو تیز تر تیز گام کر دو

عدم جوازِ شراب ناطق روا ہے اُن پر جو محتسب ہوں
یہ کیا غضب ہے کہ پینے والوں پہ اس کا پینا حرام کر دو

ابھی تو شاد ہو دل میں مری بربادیٔ دل سے
بہت پچھتاؤ گے جس روز اٹھ جاؤں گا محفل سے

نگاہیں ان کے جلووں میں اُلجھ کر رہ گئیں ورنہ
بہت آگے نکل جاتا حدودِ مقصدِ دل سے

یہ کیا مہر و محبت ہے یہ کیا ناز و نمائش ہے
بلاتے بھی ہو محفل میں اٹھاتے بھی ہو محفل سے

شگفتہ خاطری جس وقت تک حاصل نہیں ہوتی
قفس تو خیر گلشن میں بھی جی لگتا ہے مشکل سے

مری کشتی کو ناطق ایک دن برباد ہونا ہے
بچے گی موج و طوفاں سے تو ٹکرائے گی ساحل سے

جہاں نظر جا کے رُک گئی ہے جہاں نظر باز تھک گئے ہیں
ہم اُن مقامات سے بھی آگے گئے ہیں اور بے دھڑک گئے ہیں

نگاہ کے تیر تیر ہو کر بھی یوں نہ برما سکے جگر کو
کبھی کبھی چشمِ شوق جتنے ترے اشارے کسک گئے ہیں

غمِ جدائی سے تنگ آکر کیا ہے جب میں نے کوئی نالہ
کئی نقاب اُٹھ گئے ہیں سر سے کئی کلیجے دھڑک گئے ہیں

اُدھر ہیں شیخ حرم کے فتوے اِدھر میں دل میں یہ سوچتا ہوں
وہ کیسے پہنچیں گے تا بہ منزل جو راستے میں بہک گئے ہیں

نہ کاملِ عشق کوہکن تھا نہ واقفِ رازِ عشق مجنوں!
یہ سنگ ریزے تو دھوپ پا کر دمک اُٹھے ہیں چمک گئے ہیں

تمہاری یادوں کی روشنی کو لیے ہوئے راہِ جستجو میں
جدھر جدھر سے گزر گئے ہم دیار و در تک مہک گئے ہیں

خدا ہی جانے زمانہ کیا کیا فسانے اُن کے بنائے ناطق
وہ چند آنسو جو اُن کی آنکھوں سے وقتِ رخصت چھلک گئے ہیں

اظہارِ التفات ہے کس کس ادا کے ساتھ
کچھ مہربانیاں بھی ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

دیکھیں درِ قبول سے ملتا ہے کیا جواب
اک نالۂ سحر بھی گیا ہے دعا کے ساتھ

کب تک یہ روز روز کی تکلیفِ دل دہی
اے چارہ ساز زہر بھی تھوڑا دوا کے ساتھ

ہم بندگانِ جبرِ مشیّت ہیں حشر میں
دادِ خطا بھی پائیں گے عذرِ خطا کے ساتھ

اک اور تازہ دردِ طلب آ کے دے دیا
یہ تم نے کیا کیا دلِ صبر آزما کے ساتھ

ناطوقِ بُتانِ دہر سے کیا شکوہ سنج ہو
اپنا معاملہ تو ہے اپنے خدا کے ساتھ

غیر پھر غیر ہیں نظروں سے اُتر جائیں گے
تم سلامت رہو یہ دن بھی گزر جائیں گے

داغ رہ جائیں گے دل پر تری سفاکی کے
زخم کی فکر نہیں زخم تو بھر جائیں گے

آپ کے وعدوں کا ہر چند یقیں ہے لیکن
آپ کے وعدے ہی کیا آپ مُکر جائیں گے

باغباں فکر نہ کر فصلِ بہار آنے دے
پھول تو پھول ہیں کانٹے بھی نکھر جائیں گے

اُن کی محفل میں رسائی ہو کہاں ایسے نصیب
ہم تو شاید اسی اُمید میں مر جائیں گے

یوں نہ گزریں گے ہم اس دامگہِ ہستی سے
دیکھتے بھالتے تا حدِ نظر جائیں گے

نہ آئی راس اُن کی چارہ فرمائی تو کیا ہوگا
مقدر نے دکھائی اپنی دارائی تو کیا ہوگا

چلے تو ہیں کسی کی بزم میں ہم دل کو بہلانے
وہاں جا کر طبیعت اور گھبرائی تو کیا ہوگا

بہ قدرِ ضبط دل پر جبر کر لوں گا مگر یارو
شکستِ آرزو پر آنکھ بھر آئی تو کیا ہوگا

بہ قدرِ ضبط دل پر جبر کر لوں گا مگر یارو
شکستِ آرزو پر آنکھ بھر آئی تو کیا ہوگا

قریبِ صبح کچھ سامانِ بیداری ہوا تو ہے
زمانہ سو گیا پھر لے کے انگڑائی تو کیا ہوگا

محبت جاوداں اور اہلِ دنیا نکتہ چیں یارب
یہی میں ہوں یہی ہے میری رسوائی تو کیا ہوگا

ابھی تو دیکھنے والے ہی ناطق مسکراتے ہیں
خود اپنے حال پر مجھ کو ہنسی آئی تو کیا ہوگا

حضورِ حسن غمِ عشق مستجاب کہاں
چلا ہے لے کے دلِ خانماں خراب کہاں

ہمارا حال بڑے مُسکرا کے پوچھتے ہیں
کرم نوازیٔ احباب کا جواب کہاں

جہاں پہنچ کے ہو عرفانِ زندگی حاصل
ابھی نگاہ میں وہ عالمِ خراب کہاں

زمانہ کچھ بھی کہے میں تو یہ سمجھتا ہوں
تمہارا نقشِ کفِ پا ہے ماہتاب کہاں

کچھ اس میں اشک ہیں کچھ خونِ دل کے قطرے ہیں
ہمارا جام سفالیں کہاں شراب کہاں

ہنوز اک دلِ زندہ ہے میرے پہلو میں
مگر وہ شورِ سیہ مستیٔ شباب کہاں

سبھی کے اُن کے ہی الفاظ ہیں مگر قاصد
ترے بیان میں وہ شوخیٔ جواب کہاں

کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں زعمِ خود نمائی ہے
ہر ایک ذرہ پرستارِ آفتاب کہاں

شمعیں جلتی رہیں جام چلتے رہے
اور ہم تشنہ لب ہاتھ ملتے رہے

ضبطِ غم کے تقاضے نہ پورے ہوئے
سوزِ پنہاں سے سینے پگھلتے رہے

جتنی جتنی رہِ شوق کھنچتی گئی
ہم بھی بڑھتے گئے ہم بھی چلتے رہے

عمر بھر لب پہ آیا نہ حرفِ گلہ
شکوے سجدوں کے سانچے میں ڈھلتے رہے

رہنمائی کی مشعل لیے ہاتھ میں
راہزن اپنی راہیں بدلتے رہے

سُنتے ہیں آج ناطق بڑی دیر تک
کچھ مناتے رہے کچھ مچلتے رہے

بسا اوقات یہ بھی رنگِ دوراں میں نے دیکھا ہے
پریشاں کرنے والوں کو پشیماں میں نے دیکھا ہے

جسے دیکھیں تو شاید اہلِ طاعت بھی تڑپ اٹھیں
نگاہِ رند میں وہ سوزِ ایماں میں نے دیکھا ہے

ستم اِک داغ ہے پیشانیٔ آئینِ دوراں پر
مگر ایسا ہی کچھ آئینِ دوراں میں نے دیکھا ہے

ہوا دیتے رہے ہو جس سے تم مہر و محبت کی
اُسی دامن پہ کچھ خونِ شہیداں میں نے دیکھا ہے

ہمیشہ جس کو میں نے خود ہی ڈھونڈا اور نہیں پایا
وہ عالم اُن کے چہرے سے نمایاں میں نے دیکھا ہے

محبت ہی کو ناطق کچھ حیات افروز پاتا ہوں
محبت ہی کو وجہِ کاہشِ جاں میں نے دیکھا ہے

مری قسمت کا جب گردش میں کوئی جام آیا ہے
تو وہ بھی شکوہ سنجِ گردشِ ایام آیا ہے

یہ رہ رہ کر تڑپنا کیا یہ تھم تھم کر مچلنا کیا
دلِ مغموم ایسا آج کیا پیغام آیا ہے

زمانے کے حوادث اب مری راہوں سے ہٹ جائیں
مجھے پھر کچھ خیالِ خاطرِ ناکام آیا ہے

یہ دنیا تو بجائے خود دل آزاروں کا مرکز ہے
کہاں او داد خواہِ گردشِ ایام آیا ہے

صدائے درد بن کر جو ہمارے دل سے نکلی تھی
وہی آواز دیتا انقلابِ شام آیا ہے

جبینِ پُرشکن سے ان کی ناحق صاف ظاہر ہے
تری عرضِ طلب پر تجھ پہ کچھ الزام آیا ہے

زندگی اپنے مقاصد میں ہے ناکام ابھی!
کہہ دو ساقی سے کہ گردش میں رہے جام ابھی!

جس طرف چاہے بدل دوں رُخِ ایام ابھی
میرے ہاتھوں میں ہے نبضِ سحر و شام ابھی

کس کا دیوانہ ہوں میں کون ہوں میں کیا ہوں میں
ان حوالوں سے نہ لو کوئی میرا نام ابھی

سازِ ہستی پہ تھے کچھ نغمۂ دلکش رقصاں
کیا خبر کس کے لبوں پر تھا مرا نام ابھی

حسرتِ صبحِ تمنا ترا انجام بخیر
سحر آثار نہیں تیرگیٔ شام ابھی

عشقِ صادق کا تقاضا نہ ہو یہ بھی ناطقؔ
جس کو میں سمجھا ہوں اپنی طلبِ خام ابھی

تم سے آنکھ چُراتا کیا
تم جیسا ہو جاتا کیا

جینے سے گھبراتا کیا
گھبرا کر مر جاتا کیا

آنکھ میں دو آنسو بھی نہ تھے
روتا کیا چھلکاتا کیا

خاموشی کچھ کام تو آئی
شکوے کر کے پاتا کیا

سمے سمے کے ساتھی ہیں
داتا کیا اَن داتا کیا

میں کہ نہ تھا سورج کی کرن
اوسوں پیاس بجھاتا کیا

ناطقؔ تم کو دل دے کر
دیوانہ کہلاتا کیا

وہ دل ہے نہ اب وہ سروسامانِ تمنّا
اے وائے بریں منزلِ ویرانِ تمنّا

ظلمت کدۂ دہر کا ہر ذرّہ ہے خورشید
روشن انہیں ذرّوں سے ہے ایوانِ تمنّا

تم بھی ہو خفا ہم سے تو لو آج سے، ہم بھی
ڈھونڈیں گے کوئی گوشۂ ویرانِ تمنّا

اے وعدہ فراموش کہیں جلد بھی آجا
بجھنے کو ہے اب شمعِ شبستانِ تمنّا

ہر داغ نظر آتا ہے مرجھایا ہوا پھول
دل ہے کہ کوئی گوشۂ ویرانِ تمنّا

نومیدیِ پیہم سے بھی کچھ فرق نہ آیا
بڑھتا ہی رہا جوشِ فراوانِ تمنّا

ناطق کی طرح اور بھی کچھ شعلہ بیاں ہیں
ناطق ہی نہیں صرف غزلخوانِ تمنّا

کچھ ایسے نقش بھی راہِ وفا میں دیوانے
نگاہِ خضر جنہیں حشر تک نہ پہچانے

یہ زندگی تو بہر حال کاٹنا ہوگی
سکوں نہیں تو تڑپ کر گزار دیوانے

ہمیں تو صرف نشاطِ شراب سے ہے غرض
شراب کیا ہے اسے پیرِ میکدہ جانے

حرم کی سمت چلے ہیں بتوں کو ٹھکراتے
الٰہی خیر کدھر بڑھ رہے ہیں دیوانے

وہ تیری بزم طرب ہے مری نگاہوں میں
خود ہاتھ بڑھ کے جہاں بن گئے ہوں پیمانے

تمام عمر چلے آپ کے اشاروں پر
تمام عمر مگر آپ کو نہ پہچانے

حقیقتیں بے نقاب کر دے شریعتیں بے نقاب کر دے
نگاہ کے سب قصور ہیں یہ نگاہ کا سدِ باب کر دے

تمہیں بتا وہ خانہ برباد کس کا ہو کر رہے جہاں میں
جسے نگاہِ کرم تمہاری تباہ کر دے خراب کر دے

دلوں میں شعلے بھڑک رہے ہیں فسانۂ درد کیا سناؤں
کہیں کوئی اور حشر برپا نہ شورشِ اضطراب کر دے

وہ آہِ گردوں جناب ہی کیا وہ نالۂ کامیاب ہی کیا
جو سوزِ دل کو تباہ کر دے جو سازِ دل کو خراب کر دے

نہ مرکزِ برقِ طورِ سینا نہ درخورِ لطفِ خاص موسیٰ
نظر جسے سرفراز کر دے طلب جسے کامیاب کر دے

رہینِ عشرت رہے گا کب تک حریفِ غم بن کے سامنے آ
سکونِ دل پھر ملے گا پہلے سکونِ دل کو خراب کر دے

یہ کالی کالی گھٹائیں ناطقؔ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ناطقؔ
دلِ فسردہ کو آج تو بھی غریقِ موجِ شراب کر دے

نہ صحرا سے مجھے نسبت نہ مرکز میرا ویرانے
تعین کی حدوں میں کب رہا کرتے ہیں دیوانے

مرے حالِ زبوں پر کس لیے ہنستے ہیں بیگانے
تعجب ہے کہ اپنے ہو کے تم یہ بھی نہ پہچانے

کہاں کی شمع محفل کس کی محفل کیسے پروانے
سحر ہونے سے پہلے ختم ہیں یہ سارے افسانے

نہ یہ دامن کے ٹکڑے ہیں نہ یہ چاکِ گریباں کے
محبت کی زباں میں ہیں محبت کے کچھ افسانے

مذاقِ عشق بخشا ہے تو ذوقِ آگہی بھی دے
وہ تجھ کو کیا سمجھ سکتا ہے جو خود کو نہ پہچانے

حصولِ آرزو پر اس قدر نازاں نہ ہو ناطق
لبوں تک آتے آتے بھی چھلک جاتے ہیں پیمانے

محبت کی زباں شرمندۂ آہ و فغاں کیوں ہو
کسی کی آڑ لے کر دردِ مجبوری بیاں کیوں ہو

نشیمن میں کہاں کا شاخِ سنبل پر بسیرا تھا
قفس کی تیلیوں میں رہ کے دل ناشادماں کیوں ہو

نہ آئے مسکرانا اشک پی جانا تو آتا ہے
مرے چہرے سے میرا رنجِ محرومی بیاں کیوں ہو

ہم اپنے راستوں پر چل رہے ہیں دشتِ غربت میں
ہماری راہ میں حائل کوئی سنگِ گراں کیوں ہو

سمجھتا سب ہوں لیکن بیشتر ایسا بھی سوچا ہے
کہ یہ سوز و گدازِ دل یہاں کیوں ہے وہاں کیوں ہو

زمانہ جس کو سنکر ہاتھ کانوں پر رکھے ناطق
خدا ناکردہ ایسا میرا اندازِ بیاں کیوں ہو

کچھ روز شاد ہو لے اے گردشِ زمانہ
مٹ جائے گا نشیمن رہ جائے گا فسانہ

ہر شے بجائے خود ہے فی الجملہ اِک حقیقت
پھر بھی ہر اِک حقیقت یا خواب یا فسانہ

کعبے کی رفعتوں پر شیخِ حرم نہ اترا
یہ گھر بسا ہے لُٹ کر میرا شراب خانہ

چشمِ فلک سے یارب اپنی اماں میں رکھنا
پھولوں میں تُل رہی ہے کیا شاخِ آشیانہ

سنتے ہیں بجلیوں نے گلشن کو پھونک ڈالا
کیا ہم نشیں یہ سچ ہے اُف میرا آشیانہ

تقدیر بھی بدل دے فطرت بدلنے والے
مشکورِ غیر کیوں ہو ناطقؔ کا آب و دانہ

نالے ہی نہیں نغمے بھی کبھی پیغامِ بلکا ہو جاتے ہیں
افسوس ہے اُن پر جن کے یہ احساس فنا ہو جاتے ہیں

جب چشمِ بصیرت پر میری فیضانِ بہاراں ہوتا ہے
کانٹے بھی عزیزِ جاں مجھ کو پھولوں سے سوا ہو جاتے ہیں

ہم اپنی آنکھوں میں ایسے کچھ اشک لیے بیٹھے ہیں ابھی
دنیائے محبت میں جن سے طوفان بپا ہو جاتے ہیں

میں نے تو بہت کچھ سوچ لیا اب تو ہی بتا اے دوست مرے
یہ ترکِ وفا کے منصوبے کیوں نذرِ وفا ہو جاتے ہیں

تعریفِ مہ و مینا ناطقؔ یارانِ وفا سے کیا کیجے
ہم سے تو باتوں باتوں میں یہ لوگ خفا ہو جاتے ہیں

کون کہتا ہے غمِ دل کا مداوا کیجئے
خونِ دل فرمائیے خونِ تمنّا کیجئے

چاہتا ہوں کیجئے کچھ اُن سے عرضِ مدعا
سوچتا ہوں اُن سے عرضِ مدعا کیا کیجئے

بادہ نوشی کر رہے ہیں بت پرستی کر چکے
چار دن کی، زندگی میں اور کیا کیجئے

ہو سکے تو یوں برافگندہ نقاب آؤ کبھی
دیکھنے والے پکار اُٹھیں کہ پردہ کیجئے

دیکھئے سینے سے دل کھنچ آئے نہ نظروں کے ساتھ
اس محبت سے مری جانب نہ دیکھا کیجئے

یہ ہوائیں یہ گھٹائیں یہ فضائیں پھر کہاں
آج تو کچھ اہتمامِ جام و مینا کیجئے

تم کو ناطقؔ دل گنوانے کے بڑے ارمان تھے
عمر بھر اب ماتمِ خونِ تمنّا کیجئے

وہاں وحشت کا ساماں تھا یہاں وحشت کا امکاں ہے
گُلستاں پھر گُلستاں ہے بیاباں پھر بیاباں ہے

پھر آخر کیا تماشہ کارسازِ بزمِ امکاں ہے
مجھے دنیا پہ پیار آتا ہے دنیا مجھ سے نالاں ہے

کبھی جو وسعتِ عالم کو خاطر میں نہ لاتا تھا
وہی دیوانہ اب شرمندۂ گورِ غریباں ہے

کسی کو بُتکدہ پیارا کوئی کعبے کا شیدائی
خدا جانے کہاں کی خاک سے تخلیقِ انساں ہے

جنوں کی پردہ پوشی غیر ممکن تو نہیں لیکن
بڑا قصّہ تو یہ آویزشِ دست و گریباں ہے

بھروسہ بھی کروں تو کیا کروں اے ناخدا تجھ پر
ترے دستِ تصرف میں نہ موجیں ہیں نہ طوفاں ہے

مجھے رونا نہ آئے اپنی بربادی پہ کیوں ناطق
وہی گھر جو گلستاں تھا وہی گھر اب بیاباں ہے

راہ میں غنچے بچھائے کام خاروں کے لیے
کیا نہیں سوچا گیا ہم پا فگاروں کے لیے

پرسشِ حالات اٹھتے بیٹھتے اور وہ بھی یوں
جیسے ہم اِک مشغلہ ہوں غم گساروں کے لیے

دل تو بے شک کچھ بہل جائے گا لیکن ہم نوا
کون شرمندہ ہو دو دن کی بہاروں کے لیے

آپ کے دورِ کرم میں نا اُمیدی کے سوا
اور رکھّا بھی ہے کیا امیدواروں کے لیے

شعلہ زن ہے آج تو کل خاک بھی ہو جائے گا
دل میں گنجائش کہاں غم کے شراروں کے لیے

دورِ عشرت میں مآلِ عیش پر کب تھی نظر
وہ زمانہ تھا زمانہ ساز یاروں کے لیے

مری نگاہ میں شمس و قمر سما نہ سکے
یہ آئینے بھی تمہارا جواب لا نہ سکے

وہ راز جس کو چھپائے کوئی چھپا نہ سکے
ہوا ہے حکم کہ زنہار لب پہ آ نہ سکے

نگاہِ شوق کی گرویدگی چھپا نہ سکے
ہزار بات بنائی مگر بنا نہ سکے

قفس میں تھے تو ہجوم بہار تھا کیا کیا
رہا ہوئے تو نقوشِ بہار پا نہ سکے

نئے خدا تو بہت سے بنا لیے ہم نے
کوئی زمین کوئی آسماں بنا نہ سکے

کچھ اُن کے دل کی خبر بھی ہے جو گلستاں میں
بہار بن کے رہے اور مُسکرا نہ سکے

ہماری فکر کو حاصل فروغ کیا ہوتا
غمِ جہاں سے تو ناطقؔ فراغ پا نہ سکے

ترکِ گناہ سے بھی گنہ گار ہو گئے
اب تو ترے کرم کے سزاوار ہو گئے

کیا کم ہے یہ کہ آپ کے ناکامِ آرزو
لذت شناس شیوۂ آزار ہو گئے

عرضِ وفا قبول نہ عذرِ وفا قبول
کس کشمکش میں ہائے گرفتار ہو گئے

ان کم نگاہیوں کا سبب جانتا ہوں میں
شاید مری نظر سے خبردار ہو گئے

کیا لے کے جائیں اہلِ حرم کے حضور میں
سجدے تو سارے صرفِ درِ یار ہو گئے

ناطق کو فکرِ شعر نہ دانش کو فکرِ داد
سب اپنے اپنے غم میں گرفتار ہو گئے

مجھ کو برباد کیا مجھ کو مٹایا تو سہی
کسی مصرف کا مجھے آپ نے پایا تو سہی

درد ناقابلِ برداشت اذیّت تھا مگر
درد کے نام میں کچھ لطف سا آیا تو سہی

عقل تو پردۂ حائل ہی بنی جب بھی بنی
عشق نے رُخ سے نقاب اُنکے اٹھایا تو سہی

کر دیا ذوقِ طلب نے مجھے برباد تو کیا
ایک میدانِ عمل سامنے آیا تو سہی

خونِ مظلوم غلط خونِ خطاوار بجا
دامنِ تیغ پہ دھبہ نظر آیا تو سہی

پےٴ غارت ہی سہی شکر تو اس بات کا ہے
آپ نے میری طرف ہاتھ اٹھایا تو سہی

سخت مشکل تھا اٹھانا غمِ جاناں ناطق
گرتے پڑتے ہی سہی ہم نے اٹھایا تو سہی

نکلے تھے آج گھر سے بڑے اہتمام سے
دو چار گام بھی نہ بڑھے راہِ عام سے

یہ کہہ کے ہم نے جام لبوں سے لگالیا
جتنی حرام ہو وہ چھلک جائے جام سے

کل جن کو ہم سمجھتے تھے یارانِ باصفا
دل کانپ کانپ اٹھتا ہے آج اُنکے نام سے

اُن کو بھی آہِ نیم شبی نے بجھا دیا
جو صبح کے چراغ جلائے تھے شام سے

ناطق خدا ہی جانے کہ ہنگامِ فصلِ گل!
کس سمت کی ہوائیں چلیں کس مقام سے

حالی کے رنگ میں

خلشِ عشق کو تسکین دوبارا آجائے
راہ سے لوٹ کے وہ انجمن آرا آجائے

کس مپرسی پہ ہماری نہ ہنسے پیرِ مغاں
کیا خبر کل کوئی پھر وقت ہمارا آجائے

گرچہ طوفاں کا بظاہر نہیں امکاں کوئی
خیریت ہے تو کچھ اس میں کہ کنارا آجائے

گردشِ چرخ سے ڈرتے رہیں اہلِ ثروت
اس کی زد میں نہ کہیں اُن کا ستارا آجائے

ڈوبنے والے اُبھرنے کی بھی کچھ فکر رہے
ہاتھ شاید کسی تنکے کا سہارا آجائے

کہہ رہا ہے لبِ ساحل سے حبابِ دریا
ساتھ جس دوست کو دینا ہو ہمارا آجائے

شوقِ دیدار میں پتھرا گئیں آنکھیں ناطق
اب تو جلدی وہ نظر یار ہمارا آجائے

زندہ ترے کرم پہ ہم اے باغباں نہیں
دیوانگی بخیرِ گلستاں کہاں نہیں

اب کس کو رازدارِ محبت بنائیے
دل جیسا رازدار ہی جب رازداں نہیں

میری نظر سے آپ بچیں گے کہاں تلک
بندہ نواز میری نگاہیں کہاں نہیں

ہر پھول سینہ چاک ہے ہر غنچہ مضمحل
کس کی زباں پہ آج مری داستاں نہیں

باور نہ ہو تو چیر کے دل دیکھ لیجئے
کہنے کی بات سوزشِ داغِ نہاں نہیں

میرا جنونِ عشق تو رُسوائے خلق ہے
لیکن حضور خود بھی جہاں تھے وہاں نہیں

وہ اُن کی بارگاہ ہو ناطق کہ بُت کدہ
ہم کو کہیں فراغ تہہ آسماں نہیں

اس دل کی پیاس تشنۂ جامِ شراب ہے
اب میری خامشی مرے حق میں عذاب ہے

مانا کہ ایک خواب جہانِ خراب ہے
لیکن یہ خواب کونسی دنیا کا خواب ہے

دیں خود وہ جام بھر کے تو سمجھو شراب ہے
کیا خونِ دل کا پینا بھی یارو عذاب ہے

حسنِ بتانِ دہر فریبِ نظر سہی
اس دل کی دھڑکنوں کا مگر کیا جواب ہے

بے مہر تیرے عہد میں ایسا بھی ہے کوئی
جو کہہ سکے کہ میری وفا کامیاب ہے

بیدار جس سے ہوتی ہے تقدیرِ انقلاب
وہ کاوشِ نگاہ ابھی محوِ خواب ہے

میں چاہتا ہوں عمرِ دراز پئے نشاط
اور زندگی کا نام غمِ بے حساب ہے

آتی نہیں نظر کوئی تعبیرِ زندگی
دنیا ہنوز میری نگاہوں میں خواب ہے

شمعیں شریکِ بزم ہیں پروانے باریاب
کچھ ہے اگر انہیں تو مجھی سے حجاب ہے

میرے جگر کا داغ مجھے کیوں نہ ہو عزیز
ناطق یہ داغ داغ نہیں آفتاب ہے

کیا ضبطِ سوزِ محبت یہاں تک
کہ دل پھُک گیا اُف نہ آئی زباں تک

گراں باریٔ خوابِ راحت کہاں تک
پہنچنا ہے اک منزلِ بے نشاں تک

وہی ایک صورت وہی ایک جلوہ
فرازِ یقیں سے فضائے گماں تک

خبر بھی ہے دلدادگانِ نشیمن
یہ تنکے کسی دن نہ دیں گے دھواں تک

پناہِ محبت پناہِ دو عالم
پناہِ محبت بھی آخر کہاں تک

یہی ہے خوشی چارہ گر کی تو ہم بھی
جئیں گے مداوائے دردِ نہاں تک

جنہیں کہہ کے پھر کچھ نہ کہنا تھا اُن سے
وہی دل کی باتیں نہ آئیں زباں تک

سُنی تو مری داستاں سب نے ناطقؔ
نہ پہنچا کوئی حاصلِ داستاں تک

اُستواری پائداری پختگی کچھ بھی نہیں
زندگی کا نام سب کچھ زندگی کچھ بھی نہیں

ساری دُنیا جلوہ گر ہے جلوۂ صد رنگ سے
میرے مالک میرے گھر میں روشنی کچھ بھی نہیں

بندہ پرور مہربانی کیا اسی کا نام ہے
جو یہ مجبوری کبھی کچھ اور کبھی کچھ بھی نہیں

ذوقِ کامل ہو تو ہر ہر لمحہ عمرِ جاوداں
یہ نہیں تو پھر حیاتِ سرمدی کچھ بھی نہیں

ایک طوفانِ حوادث ایک سیلابِ بلا
ہم تو سمجھے تھے ہماری زندگی کچھ بھی نہیں

مجھ کو اپنے ذوق کی بے مائیگی تسلیم ہے
دینے والے تیری بخشش میں کمی کچھ بھی نہیں

رنجِ بے پایاں تھا لطفِ چند روزہ کا مآل
سچ ہے ناطق چار دن کی چاندنی کچھ بھی نہیں

خدا کسی سے ملے کفر دوستی سے ملے
نشانِ منزلِ ہستی ملے کسی سے ملے

نظر پہ کچھ اور زباں پر کچھ اور دل میں کچھ اور
یہ حال ہو تو بھلا کیا کوئی کسی سے ملے

سمجھ رکھا تھا جنہیں ہم نے رازدارِ حیات
نگاہ کی تو بہت دور زندگی سے ملے

گدا نوازئ برق و شرر قبول مگر
کبھی کبھی تو کوئی آنچ زندگی سے ملے

ہزار بار پسِ پردۂ حجاب و نقاب
تمہیں بھی دیکھ لیا تم بھی اجنبی سے ملے

یہی کشاکشِ بیجا ہے رات دن ناطقؔ
تو زندگی کا مزہ خاک زندگی سے ملے

قیامت ہے دوامِ عیش جس کے نام آجائے
اُسی محفل سے آوازِ شکستِ جام آجائے

خیالِ گردشِ دوراں ابھی تو کیا کہوں تجھ سے
ذرا ہاتھوں میں جامِ بادۂ گلفام آجائے

نہ پوچھو میں ہلاکِ کاوشِ بیداد ہوں کس کا
بہت ممکن ہے لب پر آپ ہی کا نام آجائے

گدائے میکدہ ہوں تشنہ لب ہوں دور بیٹھا ہوں
مرے ساقی اِدھر بھی اب تو دورِ جام آجائے

نشاطِ صبحِ عشرت بھی نہیں اُس کے مقدر میں
خیالِ شامِ غربت جس کو قبل از شام آجائے

بظاہر، ہم بھی اپنے دَور میں کچھ کم نہیں ناطقؔ
مگر مقسوم میں جس کے قبولِ عام آجائے

زمیں کی گردش پہ ہنس رہا ہوں فلک سے آنکھیں لڑا رہا ہوں
نئی نئی زندگی ملی ہے نئے نئے گیت گا رہا ہوں

دلِ طپیدہ کی ہر تڑپ میں اِک ایسی آواز پا رہا ہوں
کہ جیسے سچ سچ ہی کوئی مجھ سے یہ کہہ رہا ہو میں آ رہا ہوں

اُمیدِ عیش و فراغ لیکر تمہاری محفل میں آ رہا ہوں
خود اپنے ہاتھوں سے اپنے حق میں بڑے بڑے وقت لا رہا ہوں

مرے مذاقِ ستم کشی کا یہ کون سا دور ہے الٰہی
زمانہ ٹھکرا رہا ہے اور میں کھڑا کھڑا مسکرا رہا ہوں

چمن سے تا شاخِ آشیانہ اور آشیاں سے درِ قفس تک
میں کیا بتاؤں کہاں کہاں کس عذاب میں مبتلا رہا ہوں

اس آرزو میں کہ مجھ سے درسِ حیات لے کوئی آنے والا
اِک آئینہ ہوں کہ راستے میں پڑا ہوا جھلملا رہا ہوں

حرم نشینوں کی انجمن میں صنم پرستوں کی محفلوں میں
جہاں جہاں بھی گزر ہوا ہے مجھی کو میں ڈھونڈتا رہا ہوں

مجھے بہاروں سے کیا تعلق مجھے گلستاں سے واسطہ کیا
کہ مدت العمر میں تو ناطق اسیرِ دامِ بلا رہا ہوں

زباں پہ کیوں آتا حرفِ شکوہ لبوں پہ کیوں آتی بات کوئی
تری خدائی میں کاش ہوتا نظر نوازِ حیات کوئی

نہ ہو جب اپنی نظر میں اپنا ہی دردِ دل در خورِ مداوا
تو پھر کہوں بھی کسی سے میں کیا سنے بھی کیوں میری بات کوئی

نہیں غمِ جاں گداز کوئی مگر ترا اِک غمِ محبت
نہیں علاجِ غمِ محبت مگر ترا التفات کوئی

ستونِ دیر و حرم ابھی تو ہمیں نہیں فرصتِ نظارا
نگار خانوں سے لوٹ آئیں تو پھر کریں تم سے بات کوئی

جنابِ ناطقؔ تو اس طرح جھومتے آج آ رہے ہیں
گھنیری زلفوں کے سائے میں جیسے کاٹ کر آئے رات کوئی

نہ مجبورِ وفا ہوتا نہ مشکورِ وفا ہوتا
مرا معیارِ الفت کاش ترکِ مدعا ہوتا

تمہارا دل اگر میری طرح درد آشنا ہوتا
تو یہ بیگانۂ دادِ طلب ہی کیوں ہوا ہوتا

نہ عرضِ مدعا کرتے نہ خونِ مدعا ہوتا
کیا تھا ضبطِ غم تو کاش منہ بھی سی لیا ہوتا

تمہیں معلوم پھر کچھ شیوۂ اہلِ وفا ہوتا
کبھی بھولے سے مجھ کو بے وفا کہہ تو دیا ہوتا

نہ یاں اظہارِ دردِ عشق کیا کرتی زباں ہی تھی
دلِ عرضِ مدعا کرتا تو کچھ مطلب ادا ہوتا

شبِ مہتاب میں گیسو بکھیرے گھومنے والے
تجھے بھی کاش کچھ اندازۂ شامِ بلا ہوتا

فریبِ سعیٔ خوش انجام میں کیا خاک رکھا ہے
غمِ بیچارگی کیا درد بنتا کیا دوا ہوتا

ہے اس بے اعتنائی پر تو یہ گرویدگی ناطقؔ
اگر وہ بے مروت باوفا ہوتا تو کیا ہوتا

اس توقع پر کہ اب منزل پہ پہنچا جائے ہے
شوقِ بے حد اور بڑھتا اور بڑھتا جائے ہے

رازِ عالم جتنا سوچا جتنا سمجھا جائے ہے
اپنی ہستی کو وجودِ غیر پایا جائے ہے

کوئی کانٹا راہ میں جب زیرِ پا آجائے ہے
خوفِ پامالی سے دل سینے میں تھرّا جائے ہے

خانہ ویرانی سلامت اب تو اپنا ہر خیال
ایک خوابِ حسرتِ تعمیر بنتا جائے ہے

سوزِ دل سے ہر نفس آتی ہے تازہ بوئے دوست
غنچہ جتنا کھلتا جاتا ہے مہکتا جائے ہے

ہائے یہ بکھری ہوئی زلفیں یہ آنکھیں مدھ بھری
اب تمہاری سمت کس کافر سے دیکھا جائے ہے

دردِ دل کو درد سمجھا وائے ناکامی مری
دردِ دل کو تو مآلِ زیست سمجھا جائے ہے

شمع کے آنسو شکستِ جام و مینا کی صدا
جو سمجھتا جائے ہے محفل سے اُٹھتا جائے ہے

شوقِ گلچینی کا یہ عالم کہ بڑھتے ہی چلو
اور دامن ہے کہ کانٹوں سے الجھتا جائے ہے

ایک ہی مرکز پہ کھنچ کر آ گئے ہیں حسن و عشق
اب جہاں تم ہو وہیں مجھ کو بھی پایا جائے ہے

میری جانب دیکھ لیکن اس توجہ سے نہ دیکھ
مقصدِ دردِ دلِ دیوانہ بدلا جائے ہے

مجھ سے اُن کی بے رُخی از راہِ بے زاری نہیں
میرا حالِ زار ناطق کس سے دیکھا جائے ہے

گلشن میں ابھی تیرہ شبی چھائی ہوئی ہے
میں کیسے سمجھ لوں کہ بہار آئی ہوئی ہے

آنکھوں میں حیا ہونٹوں پہ ہلکا سا تبسم
یوں بھی مری نظروں کی پذیرائی ہوئی ہے

اس کشمکشِ دہر سے بچ بچ کے گزرنا
سوچا ہے تو کچھ اپنی ہی رسوائی ہوئی ہے

ہم ہی نہیں اظہارِ ستم کرکے پشیماں
اُن کی نگہِ ناز بھی شرمائی ہوئی ہے

ناطق کو وہ آواز تو گھر میں نہیں ملتے
شاید کہیں پھر تازہ شناسائی ہوئی ہے

اگر یاد رہ جائے تو یاد رکھنا
اِک اُجڑے ہوئے گھر کو آباد رکھنا

مری بات اہلِ قفس یاد رکھنا
جہاں بھی رہو فکر آزاد رکھنا

ہنسی میں بھی اکثر نکل آئے آنسو
مجھے خود نہ آیا مرا شاد رکھنا

حرم سے سوئے بتکدہ جانے والو
ذرا اپنے اللہ کو یاد رکھنا

یہ کیا شیوۂ دوست داری ہے ناطق
کرم بھول جانا ستم یاد رکھنا

شیشہ بڑھا دیا کبھی ساغر بڑھا دیا
تم نے تو التفات کا دریا بہا دیا

یا نالے دل سے تا بہ زباں بھی نہ آ سکے
یا بڑھ گئے تو عرشِ معلیٰ ہلا دیا

وہ مشتِ خاک جو کہ ازل کائنات تھی
جب کچھ نہ بن سکی تو مرا دل بنا دیا

او آئینے میں دیکھنے والے جمال کے
دیکھا، مری نظر نے تجھے کیا بنا دیا

تسلیم ہے کہ خانۂ ناطق تھا بُت کدہ
مسجد تو تیرا گھر تھا اُسے کیوں گرا دیا

جوانی آپ کی جتنی سنبھلتی جاتی ہے
مری اُمیدوں کی صورت بدلتی جاتی ہے

وہ جا رہے ہیں یہ محسوس ہو رہا ہے مجھے
کہ جیسے روح بدن سے نکلتی جاتی ہے

الٰہی، شامِ غریبی کہاں بسر ہوگی
میں تھکتا جاتا ہوں اور دھوپ ڈھلتی جاتی ہے

نظر میں سرخوشیٔ اہلِ بزم ہے ناطقؔ
کچھ آجکل مری نیت بدلتی جاتی ہے

دردِ پیہم بن گیا آزار و حرماں ہوگیا
تیرے غم نے جس طرح چاہا نمایاں ہوگیا

میری قسمت میں تو آزادی لکھی تھی مل گئی
رنج یہ ہے خانۂ صیاد ویراں ہوگیا

اب کسی کو راس آئے یا نہ آئے فصلِ گُل
اہلِ گلشن کا گلستاں تو گلستاں ہوگیا

چشمِ ما روشن ابھی باقی ہیں کچھ ویرانیاں
کون کہتا ہے ہمارا گھر بیاباں ہوگیا

میر و غالب پر ہی اے ناطق نہیں کچھ منحصر
جس پہ نظریں ڈال دیں اس نے غزلخواں ہوگیا

ہوئے ہیں جن سے بسر رات دن جفا کرتے
دوائے دردِ دلِ مبتلا وہ کیا کرتے

ہر ایک لمحہ تھا عنوانِ رنج و ناکامی
کہاں سے شکوۂ دوراں کی ابتدا کرتے

خداشناسی کے ارماں ہیں جنکو کاش وہ لوگ
کچھ اپنے آپ سے خود کو بھی آشنا کرتے

نہ جانے کون سا اب انقلاب لائیں گے
بتانِ دہر اُٹھے ہیں خدا خدا کرتے

گزر گئے خوش و ناخوش تمہارے کوچے سے
دیارِ غیر تھا شکوہ کسی کو کیا کرتے

کہتے ہو تمہیں عہدِ وفا یاد نہیں ہے
حیرت ہے کہ اپنا ہی کہا یاد نہیں ہے

بُت یاد نہیں ہیں کہ خُدا یاد نہیں ہے
کس کس کی عنایات و عطا یاد نہیں ہے

گھُٹ گھُٹ کے مَرے جاتے ہیں بیمارِ محبّت
بیچاروں کو جینے کی ادا یاد نہیں ہے

فرصت ہو تو پھر پوچھنا مے پی تھی کہ زہر اب
یہ بات ابھی مجھ کو ذرا یاد نہیں ہے

ہر چند کہ ہر ظلم ترا یاد تھا لیکن
اب کچھ بہ تقاضائے وفا یاد نہیں ہے

کچھ ربط اگر ہے بھی تو خاصانِ جہاں سے
ہر درد کی دنیا کو دوا یاد نہیں ہے

اے دوستو کیوں دیتے ہو جینے کی دعائیں
کیا تم کو کوئی اور دعا یاد نہیں ہے

کیا جانئے کیوں گردشِ دوراں ہے مخالف
ہم کو تو کوئی اپنی خطا یاد نہیں ہے

شکوہ کوئی زباں پہ میری نہ آئے پھر
اتنا ستائیے کہ ستایا نہ جائے پھر

ہم کو کسی سے بیر نہ ہم سے کسی کو بیر
بیٹھے بٹھائے کوئی ہمیں کیوں ستائے پھر

چل پھر کے دن تو کاٹ دیا جس طرح بنا
رات آئی خیریت سے رہی ہائے ہائے پھر

اچھی نہیں ہے دیکھ یہ خوئے قلندری
دیوانے خود کو یوں نہ تماشا بنائے پھر

کل کیا کہیں گے دیکھنے والے یہ آج کے
اتنا نہ دوشِ ناز پہ خود کو اٹھائے پھر

قسمت نے لا کے چھوڑا ہے اِک خارزار میں
اور اُس پہ حکم یہ ہے کہ دامن بچائے پھر

بندہ نواز اپنے سب ارماں نکال لو
ممکن ہے تابِ ضبطِ الم دل نہ لائے پھر

ناطقؔ کچھ اور صبر و تحمل سے کام لے
شاید وہ اپنی شانِ کریمی دکھلائے پھر

جدھر جاتا ہوں پیشِ پا بیاباں ہی بیاباں ہیں
مگر راہِ طلب کی وسعتیں تا حدِ امکاں ہیں

محبت جن کا مذہب ہے وفائیں جن کا ایماں ہیں
حقیقت میں وہی کچھ عاقبت اندیش انساں ہیں

غم و اندوہ صبر و یاس جبر و ناشکیبائی
یہ میری زندگی کے چند اجزائے پریشاں ہیں

معاذ اللہ یہ جوشِ جنوں کی کارفرمائی
تبسّم آفریں نغمے بھی وجہ کاہشِ جاں ہیں

نہ جانے کون ہے وہ جس کے جلووں کے تصوّر میں
میری تاریک شامیں غیرتِ صبحِ درخشاں ہیں

ذرا سی دیر بھی فرصت نہیں ملتی تڑپنے سے
بلا کی شورشیں ناطقؔ ترے سینے میں پنہاں ہیں

مشعلِ صحنِ حرم شمعِ درِ میخانہ ہم
صاحبِ کاشانہ تم ہو رونقِ کاشانہ ہم

کچھ زمانہ ہے ابھی ناواقفِ رسمِ وفا
کچھ زمانے کی روش سے ہیں ابھی بیگانہ ہم

آسماں اب اور کوئی شکلِ بربادی نکال
بجلیوں کو تو سمجھتے ہیں چراغِ خانہ ہم

جی نہ چاہا بے طلب جانے کو بزمِ ناز میں
لوٹ آئے چوم کر سنگِ درِ جانانہ ہم

ہوش میں آتے ہی ناطقؔ جانے کیا کیا ہوگیا
اب تو کچھ پاتے ہیں خود کو اور بھی دیوانہ ہم

یوں سر انجام کہیں کارِ جہاں ہوتا ہے
کیوں فغاں کر کے پشیمانِ فغاں ہوتا ہے

کب کسی نالے پہ نغمے کا گماں ہوتا ہے
اتنا دلکش تو ہمارا ہی بیاں ہوتا ہے

چارۂ غم سے مجھے منظور مگر میرے رفیق
غم پسندیدۂ صاحب نظراں ہوتا ہے

ضبطِ فریاد غلط جرأتِ نالہ معلوم
دل توانا ہو تو ہر عزم جواں ہوتا ہے

سجدہ سجدہ میں بڑا فرق ہے اے شیخِ حرم
ہر خطا دار گنہگار کہاں ہوتا ہے

ہم نشیں آج میں اُس منزلِ احساس میں ہوں
جہاں اپنوں پہ بھی غیروں کا گماں ہوتا ہے

در و دیوار کی تعمیر کا مقصد تھا کچھ اور
در و دیوار سے کچھ اور عیاں ہوتا ہے

خود غرض لوگ ہیں آج کل کے
نازنینانِ عالم سنبھل کے

کیسے ساتھی ہیں یہ آج کل کے
رہ گئے دو قدم ساتھ چل کے

اور اِک تازہ غم مول کیوں لیں
رنج کو راحتوں میں بدل کے

جس کی تقدیر میں غم ہی غم ہوں
وہ چلے بھی کہاں تک سنبھل کے

اور کچھ ساتھ دے یادِ جاناں
اور کچھ رنگ نکھریں غزل کے

نم ستاؤ تو کیسے نہ رو دیں
جوشِ بادہ ہو ساغر نہ چھلکے

کر دیا ہم کو ہشیار ناحق
کچھ مخالف ہواؤں نے چل کے

بہار آئی تو ہم کو اپنے غمخواروں کی یاد آئی
کبھی زنداں کبھی زنداں کی دیواروں کی یاد آئی

تغافل کیشیٔ اہلِ زمانہ ٹھیک ہے لیکن
کبھی تم کو بھی اپنے ناز برداروں کی یاد آئی

ہماری زندگی میں جن کے ہاتھوں انقلاب آیا
بہت دن ہم کو اُن بیگانہ خو یاروں کی یاد آئی

یہ کیوں بیٹھے بٹھائے ہو گیا اک اور غم تازہ
یہ کیوں بیٹھے بٹھائے آج غم خواروں کی یاد آئی

پس پردہ تمہاری یاد کے کیا کیا نہ یاد آیا
تمہاری یاد کیا آئی دل آزاروں کی یاد آئی

دلِ سوزاں سے میرے کچھ دھواں سا تا بہ لب آیا
قفس میں جب چمن کے شعلہ رخساروں کی یاد آئی

ستارے کیوں جھکے پڑتے ہیں ناطق شوقِ سجدہ میں
خدا جانے کسے اپنے پرستاروں کی یاد آئی

چھپ سکی نہ دل کی بات آپ کے چھپانے سے
کچھ نظر سے سمجھے ہم کچھ نظر چُرانے سے

ترکِ دوستداری کا کیا گلہ کہ وہ بھی ایک
رسم تھی زمانے کی اُٹھ گئی زمانے سے

اس خوشی کو لے کر بھی کیا کرے گا دیوانہ
جس خوشی کی راہوں میں غم ملیں زمانے سے

درد اِک اذیت ہے چارہ گر سہی لیکن
کچھ تڑپ تو لیتا ہوں میں اسی بہانے سے

ہم کو کیا خبر ناطقؔ کون تھا کہاں کا تھا
ڈھونڈئے زمانے میں پوچھئے زمانے سے

سوزشِ دل ہی علاجِ دلِ بیمار سہی
عشق راحت نہ سہی راحتِ آزار سہی

کوئی پردہ تو اُٹھے لیلیٰ شب کے رُخ سے
یہ دھندلکے ہی کسی صبح کے آثار سہی

کچھ اُجالا تو ہے ظلمت کدۂ عالم میں
شعلۂ طور چراغِ پسِ دیوار سہی

رہ روِ راہِ طلب پاؤں کے چھالوں پہ نہ جا
سلب ہوتی ہے اگر طاقتِ رفتار سہی

سربلندی کا تقاضا ہے کہ گردن نہ جھکے
دستِ دوراں میں لچکتی ہوئی تلوار سہی

وجہِ بیداریِ دل بانگِ جرس ہی کیوں ہو
کسی پائل کسی پازیب کی جھنکار سہی

میں تو سمجھا تھا کہ اِک بندۂ مجبور ہوں میں
آپ فرماتے ہیں مختار، تو مختار سہی

مردِ آزاد جھجکتے ہیں کسی سے ناطق
جو تہہ دار نہ کچھ پائے سرِ دار سہی

ظرفِ اہلِ عشق دنیا کو دکھاتا جاؤں گا
زخم کھاتا جاؤں گا اور مسکراتا جاؤں گا

کوئی میرا ہم نوا ہو یا نہ ہو کچھ غم نہیں
اپنی آزادی کے نغمے آپ گاتا جاؤں گا

مجھ سے رہ سکتا نہیں پوشیدہ رازِ کائنات
جتنا بڑھتا جاؤں گا پردے اٹھاتا جاؤں گا

دوریٔ منزل سے گھبرانا مرا شیوہ نہیں
ہر قدم پر اک نئی منزل بناتا جاؤں گا

عشرتِ رفتہ کے کچھ قصے بھی ہوتے جائیں گے
کچھ مصیبت کی کہانی بھی سناتا جاؤں گا

بتکدے سے لوٹنے تک صبر کر شیخِ حرم
تیرے کعبے میں بھی قسمت آزماتا جاؤں گا

کس طرح دنیا کو دکھلاؤں گا ناطق دل کے داغ
پھول ہوتے تو سمیٹ لیتا لٹاتا جاؤں گا

مخمور بنا جاؤ مدہوش بنا جاؤ
پیتا تو نہیں لیکن پی لوں گا پلا جاؤ

مشتاقِ تجلّی ہوں آنکھوں میں سما جاؤ
دنیا مری دنیائے نظارہ بنا جاؤ

میں کہتا ہوں کچھ دن سے یہ تم کو ہوا کیا ہے
آؤ تو خفا بیٹھو جاؤ تو خفا جاؤ

ٹوٹے ہوئے دل خالی باتوں سے نہیں جُڑتے
اب مجھ سے نہ فرماؤ اظہارِ وفا جاؤ

یہ کشمکشِ عرضِ بیدادِ ستم کب تک
ان روز کے جھگڑوں کو اِک روز مٹا جاؤ

تفریقِ نظر ناطق توہینِ محبت ہے
کعبہ میں رہو لیکن بت خانے پہ چھا جاؤ

کچھ بڑھے کچھ کسمسا کر رہ گئے
دور ہی سے دل لُبھا کر رہ گئے

کون سی بات آپ کو یاد آ گئی
زیرِ لب کیوں مُسکرا کر رہ گئے

مضمحل نالے دلِ مغموم کے
جانے کس دنیا میں جا کر رہ گئے

دیکھ لیں احباب کی غم خواریاں
وقت پر سب منہ چھپا کر رہ گئے

خاک کے ذرّوں کی ناطق کیا بساط
دھوپ نکلی جگمگا کر رہ گئے

وفاؤں سے خوشتر ہیں ان کی جفائیں
کسے یاد رکھیں کسے بھول جائیں

وہ مختار ہیں اُن کے جو جی میں آئے
بنا کر مٹائیں مٹا کر بنائیں

ذرا دیر تو اور تشریف رکھئے
مبادا کہ پھر ہوش میں ہم نہ آئیں

نہیں سازگار اب کہاں موسمِ گل
تمہیں ہمصفیرو یہ دن راس آئیں

نگاہِ کرم آشنا جانتی ہے
جس اُمید پر میں نے کی ہیں خطائیں

نہ معلوم کس روز سمجھے گی دنیا
مری چشمِ مایوس کی التجائیں

اُنھیں بھی کسی دن بُھلا دیں گے ناطق
ذرا خود کو پہلے تو ہم بھول جائیں

یاد جب اُن کے لطف و کرم آ گئے
جانے کیوں آنکھ میں اشکِ غم آ گئے

اس کے غم مٹ گئے اس کے دن پھر گئے
راس جس کو تمہارے ستم آ گئے

میری راہوں کے مالک بچا لے مجھے
میری راہوں میں دیر و حرم آ گئے

زلفِ دوراں میں جب ہم نے شانہ کیا
اور بَل پڑ گئے اور خم آ گئے

ناطقِ باصفا آپ اور میکدہ
یہ کدھر آج اے محترم آ گئے

کرم نہیں نہ سہی قہر کی نگاہ تو ہو
کسی نظر سے ہو تسکین اشک و آہ تو ہو

نظامِ دہر اگر ہوتا ہے تباہ تو ہو
دلِ شکستہ مگر آج کوئی آہ تو ہو

نہ یہ حیا ہی رہے گی نہ یہ حجاب و نقاب
کچھ اُستوار ذرا رشتۂ نگاہ تو ہو

اُمیدِ عفو نہ رکھنا تو کفر ہے لیکن
گناہ کہنے کے قابل کوئی گناہ تو ہو

پناہِ عشق میں خود حسن کھنچ کے آجائے
کسی کی آہ میں یہ جذبِ بے پناہ تو ہو

ز راہِ لطف نہ ہو پرسشِ جنوں نہ سہی
کبھی کبھی بہ تقاضائے رسم و راہ تو ہو

درِ کریم تو وا ہے ہر ایک پر ناطق
درِ کریم سے تو طالبِ پناہ تو ہو

صاحبِ دل ہوں نئی دنیا بسا سکتا ہوں میں
نسبتاً ہر عزم پر اب فتح پا سکتا ہوں میں

اعتبارِ عشق کچھ کچھ ہوتا جاتا ہے نصیب
بے تکلف اب تو جلووں میں سما سکتا ہوں میں

نغمۂ سازِ نوا ہوں شعلۂ سوز و نیاز
اس سے بڑھ کر اور خود کو کیا بنا سکتا ہوں میں

خوف ہے شاید جگر کے زخم خوں دینے لگیں
ہنسنے والو ورنہ کچھ تو مسکرا سکتا ہوں میں

طور دیکھا ہو تو ناطق طور کی باتیں کروں
تم سنو تو آپ بیتی کچھ سنا سکتا ہوں میں۔

مت پوچھئے کسی نے مجھے کیا بنادیا
دیوانہ کیا بنایا تماشہ بنادیا

او آئینے میں دیکھنے والے جمال کے
دیکھا مری نظر نے تجھے کیا بنادیا

تشویشِ کفر و دیں سے فراغت تو ہوگئی
گمراہیوں نے کام تو اچھا بنادیا

یہ کیا ستم کیا کہ مرے دل کو آپ نے
ویراں سرائے یاس و تمنا بنادیا

ساقی کی اِک نگاہ نے ساغر میں ڈوب کر
صہبا کی تلخیوں کو گوارہ بنا دیا

اللہ رے حسنِ یار کی طلعت فروشیاں
جلوے کو پردہ پردے کو جلوہ بنادیا

فائدہ معلوم رسوائے جہاں ہونے کے بعد
راز داں کو کیا کہوں اب رازداں ہونے کے بعد

باغباں کے دل میں کیا معلوم کیوں چبھنے لگے
خار و خس کے چار تنکے آشیاں ہونے کے بعد

کارواں کے ساتھ ہیں تو فکرِ منزل کیوں کریں
یہ تو سوچیں گے حریفِ کارواں ہونے کے بعد

راز جب تک راز تھا شائستہ اظہار تھا
کیا کہوں اب داستاں در داستاں ہونے کے بعد

سینۂ ناطق میں دل کی جستجو مقصود ہے
دل کہاں باقی رہا صرفِ فغاں ہونے کے بعد

سعیٔ نامشکور ہے اب رہبری میرے لیے
ہر طرف پھیلی ہوئی ہے روشنی میرے لیے

اہلِ ظاہر کی نگاہوں سے رہا محفوظ میں
ایک پردہ تھی مری دیوانگی میرے لیے

یہ ہجومِ نا اُمیدی اور یہ دشتِ ہولناک
برقِ کوہِ طور، تھوڑی روشنی میرے لیے

او سحر کے ڈوبنے والے ستارے الوداع
وجہِ صد عبرت ہے تیری زندگی میرے لیے

ہوش میں آنا مرے حق میں ستم ہو جائے گا
باعثِ تسکیں ہے ناطق بیخودی میرے لیے

میں ہوں خود اِک مستقل درسِ فنا میرے لیے
ہر نفس ہے میرا آوازِ درا میرے لیے

مشعلِ راہِ طلب ہیں میری خود آگاہیاں
دوستو بیکار فکرِ رہنما میرے لیے

ہاں یہی ناکامیٔ پیہم دلِ ہمت طلب
ہوگی اک دن باعثِ صد مرحبا میرے لیے

دینے والے تیری اس بخشش پہ سو جانیں نثار
اس قدر ارزانیِ جنسِ وفا میرے لیے

دیکھنے والوں نے دیکھا سننے والوں نے سُنا
آپ نے جو کچھ کہا جو کچھ کیا میرے لیے

دیکھئے بچتی ہے ناحق کس طرح اب جانِ زار
بچھ رہا ہے ہر طرف دامِ بلا میرے لیے

پینے میں ڈر ہے اب نہ پلانے میں ڈر مجھے
ساقی ملا ہے ساقیِ کوثر نظر مجھے

دیکھو کہ ہے بھی یا نہیں تابِ نظر مجھے
جانا ہے آج طور سے بھی کچھ اُدھر مجھے

منظور ہے نمائشِ زخمِ جگر مجھے
اور زندگی ملی ہے بڑی مختصر مجھے

صحرا کی دلفریبیو اب رخصتِ نگاہ
پھر لے چلی کہیں کششِ بام و در مجھے

میں وقفِ آہ و نالہ ہوں وہ محوِ حسن و ناز
اپنی خبر اُنہیں ہے نہ اپنی خبر مجھے

ناطق نگاہِ ناز کے قربان جائیے
بخشی ہے جس نے لذتِ زخمِ جگر مجھے

سر بہ سجدہ ہوں مگر دل ہے صنم خانوں میں
مجھ سا کافر کوئی کیا ہوگا مسلمانوں میں

کوئی اُمید بر آئی نہ کبھی زیرِ فلک
زندگی کٹ گئی ارمانوں ہی ارمانوں میں

اِس طرف بھی نگہہِ لطف و کرم رحمتِ عام
اِک گنہگار بھی بیٹھا ہے پشیمانوں میں

جان دی جاتی ہے تب ملتی ہے دو ہاتھ زمین
گھر بسانا کوئی آسان ہے ویرانوں میں

کوئی ناطق سا بھی دیندار نہ دیکھا ہوگا
ہندوؤں میں ہے وہ کافر نہ مسلمانوں میں

کعبہ ہو کہ بُت خانہ کسی کے نہ کہیں کے
ہم خانماں برباد فلک کے نہ زمیں کے

جو ہم پہ گزرتی ہے، گزرتی ہے تمہیں کیا
اب پوچھنے آئے ہیں دل آزار کہیں کے،

کیا جانئے کیا ہونے کو ہے حشرِ تمنّا
کچھ اور ہی انداز تھے آج اُن کی نہیں کے

واللہ کہ یہ بت نہیں بت خانے کے اندر
کچھ نقش نظر آئے ہیں ناطق کی جبیں کے

دیکھئے کب ہوں باریاب اُن کی حریم ناز میں
بیٹھے ہوئے ہیں سر جھکائے رہگذرِ نیاز میں

آگ نہ لگ اٹھے کہیں جلوہ گہہ مجاز میں
طور کی چوٹیاں ہیں آج اُن کی نگاہِ ناز میں

حضرتِ خضر آپ نے لطفِ حیات کھو دیا
پڑ کے کشاکشِ غمِ زندگیٔ دراز میں

مطربِ دلنوا نہ چھیڑ نغمۂ دلربا نہ چھیڑ
ایک صدائے دلخراش پردۂ سوز و ساز میں

اُف وہ جمیل تابشیں صبحِ شبِ اُمید کی
جان سی پڑ گئی مرے پیکرِ غم گداز میں

خال و خطِ ایاز پر دیدۂ بے بصر نہ جا
ذوقِ سلیمِ غزنوی ڈھونڈ رُخِ ایاز میں

اٹھتے ہیں میکدے سے آج جام و سبو کو توڑ کر
ناطقؔ سادہ لوح آئے دامِ فریبِ ناز میں

بلا سے موجِ بلا بن کے شامِ غم آئی
نظر میں زلف کی جیسی فضا تو لہرائی

وہ پردے جن کے بڑے اہتمام ہوتے تھے
وہ پردے کیوں نہیں اب پردہ پوشِ رسوائی

قصورِ چینِ جبیں کا اور آئینے پہ عتاب
ملاحظہ ہو ذرا ان کی یہ خود آرائی

بیاں گل نے کیا قصۂ شبِ ہجراں
نہ جانے کس لیے شبنم کی آنکھ بھر آئی

ستم کی شکل میں بے مہریوں کی صورت میں
کسی نظر سے سہی دادِ عیش تو پائی

اُٹھا لے ہاتھ میں اے رند جامِ مینائی
وہ ابرِ تیرہ اُٹھا دور وہ بہار آئی

وہ پوچھتے ہیں کہ ناطق بھی کوئی شاعر تھا
خوشا نصیب زہے التفات فرمائی

نہ تھی جب آہِ بے تاثیر شایانِ پذیرائی
تو یہ رسوا کُن سوزِ دروں لب تک بھی کیوں آئی

تمہاری بزم پر ہی کچھ نہیں موقوف ہم نے تو
جہاں خود پر نظر ڈالی وہیں اپنی کمی پائی

جہاں کانٹے چبھے جھک کر کیا سجدہ بیاباں کو
زمانے سے نرالی ہے ہماری دشتِ پیمائی

گل و غنچے سے ہم کو کیا ہمارا دل کھلا کس دن
بہارِ فصلِ گل آئی مگر ہم تک کہاں آئی

توجہ کے بجائے جب تغافل میں کمی ہوگی
کچھ اُس دن دیکھنے کی چیز میری زندگی ہوگی

ذرا بالائے بام آنے تو دیجئے بے نقاب اُنکو
کہیں دیوانے ہوں گے اور کہیں دیوانگی ہوگی

جنوں اور عقل کی گم کردہ راہی کا یقیں لیکن
محبت اپنی منزل میں محبت ہی رہی ہوگی

زمانہ بے سبب تو باعثِ آزار کیا ہوگا
کچھ اس میں بھی ہماری ہی مقدر دشمنی ہوگی

کرم ہو یا ستم اپنا تو ناطق یہ عقیدہ ہے
زراہِ دوستی جو بات ہوگی دوستی ہوگی

دشمنی برتی ہوئی اخلاص پہچانا ہوا
دل بھی دیوانہ ہوا تو کس کا دیوانہ ہوا

جب بہ چشمِ غور دیکھا جلوہ گاہِ دہر کو
ہر حقیقت سے نمایاں رنگِ افسانہ ہوا

اپنے اپنے خال و خط پر ہے نظر ہر شخص کی
ان کی محفل کیا ہوئی اک آئینہ خانہ ہوا

خود فراموشی پہ ناطقؔ کی تاسف کیوں نہ ہو
کیسا اچھا آدمی افسوس دیوانہ ہوا

ہے جلوہ جلوہ اِک نیا عنواں لیے ہوئے
ذوقِ نگاہ وسعتِ داماں لیے ہوئے

کس شان سے وہ دیکھ رہے ہیں جگر کے زخم
کچھ زیرِ لب تبسّم پنہاں لیے ہوئے

دنیا کو پایا اپنے ہی جیسا ستم نصیب
پہنچا جہاں جہاں غمِ دنیا لیے ہوئے

کیا حکم ہے اب او نگہہِ کفر آشنا
بیٹھا ہوں کب سے دولتِ ایماں لیے ہوئے

ناطقؔ بھی ان کی بزم میں پہنچے ہیں خیر سے
سامانِ صد نشاطِ بداماں لیے ہوئے

مزا انہیں بھی ستانے کا عمر بھر تو ملے
کسی دن اُن کی نظر سے ذرا نظر تو ملے

کچھ اور میرا مقدر نہیں تو خیر مگر
جبینِ شوق کو تھوڑی سی خاکِ در تو ملے

ترے جمال کو بیگانہ وار کیا دیکھیں
کوئی نظارا بہ اندازۂ نظر تو ملے

طوافِ کوچۂ خوباں کسے عزیز نہیں
کشاکشِ غمِ دوراں سے کچھ مفر تو ملے

متاعِ دولتِ دنیا نہ دے مگر یا رب
فضا کو میری فسوں کاریٔ اثر تو ملے

اذانِ بامِ حرم ہو کہ دیر کے ناقوس
کسی زبان میں آوازۂ سحر تو ملے

غمِ زمانہ دل و جان سے قبول، مگر
زمانہ ہم کو کسی ایک حال پر تو ملے

دل بحرِ نذر تیرے لیے لا رہا ہوں میں
پتھر کو آبگینے سے ٹکرا رہا ہوں میں

وہ کہہ کے جا رہے ہیں ابھی آ رہا ہوں میں
کیا جانے کھو رہا ہوں کہ کچھ پا رہا ہوں میں

ہر چند ہوں تو گردِ پسِ کارواں مگر
تیرے تو ساتھ ساتھ چلا آ رہا ہوں میں

کیا کیا سمجھ کے آیا تھا میں تیری بزم میں
کیا کیا تجھے نظر میں لیے جا رہا ہوں میں

ناطق اگر وہ چاہیں تو مجھ کو نواز لیں
شایانِ التفات تو اب کیا رہا ہوں میں

مستیٔ چشم تری جام تک آ پہنچی ہے
جام کیسا مئے گل فام تک آ پہنچی ہے

کیا خبر خواہشِ جلوہ ہے کہ جذبِ الفت
بات کچھ بڑھ کے در و بام تک آ پہنچی ہے

وہ نظر جو نظر آتی تھی خود اِک موجِ شراب
حسرتِ دردِ تہِ جام تک آ پہنچی ہے

رازِ مے نوشیٔ رندانِ قدح خوار کی خیر
ہر ہوس کار نظر جام تک آ پہنچی ہے

سہتے سہتے ستم و جورِ فلک کے ناطق
زندگی اِک غمِ بے نام تک آ پہنچی ہے

نظمیں

خوابِ تمنّا

حجابِ قدس میں جب حسنِ مطلق جلوہ فرما تھا
نیازِ عشق جب بیگانۂ رسمِ تمنّا تھا
کتابِ آرزوئے دل کا جب عنوان سادا تھا
مآلِ جستجو جب ایک عزمِ بے سروپا تھا
وہ اِک مَیں ہوں جسے اُس وقت بھی تیرا ہی سودا تھا

نسیمِ صبح جب اِک خاص اندازِ نزاکت سے
اٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی آغوشِ فطرت سے
سحر نے مسکرا کر زیرِ لب فرطِ مسرت سے
منور کر دیا دیوار و در کو عکسِ طلعت سے
مرا ذوقِ نظر اُس وقت مجروح مداوا تھا

اُفق کی گھاٹیوں سے جب نکل کر نیرِ تاباں
لیے ہاتھوں میں اپنے اِک طلائی مشعلِ سوزاں
بصد آہستگی کرتا ہوا طے منزلِ دوراں
سکوتِ شام کی تاریکیوں میں ہو گیا پنہاں
مرے پیشِ نظر اُس وقت بھی تیرا ہی سودا تھا

شرابِ خندۂ صبحِ ازل کے مست دیوانے
بڑھے لے لے کے جب ایمن کی جانب اپنے پیمانے
پکارا طالبِ دیدار کو، برقِ تجلّا نے
صدا لبّیک کی ایک ایک ذرّے سے لگی آنے
ہرے دل میں امید و یاس کا اِک حشر برپا تھا
ستاروں کی چمک میں آبشاروں کی روانی میں
گلوں کے رنگ و بو میں بلبلوں کی خوش بیانی میں
بالآخر جب نہ پایا تجھ کو ان اجزائے فانی میں
تو یہ کہنا پڑا مجھ کو زبانِ بے زبانی میں
کہ میری ہستیٔ موہوم اِک "خوابِ تمنّا" تھا

9-2-1950

دعوتِ عمل

سراپا یاس ہوجا یا سراپا جستجو ہوجا
غرض جو کچھ بھی ہونا ہے دلِ آشفتہ خو ہوجا

بسالے یا تمناؤں کی دنیا اپنے سینے میں
مٹا کر یا تمنا کو حریفِ آرزو ہوجا

فضائے رنگ و بو میں جذب کر دے اپنی ہستی کو
حریفِ رنگ و بو یا خود فضائے رنگ بو ہوجا

جلا دے آہِ آتش بار سے کشتِ تمنا کو
ریاضِ دہر میں یا جوششِ نشو و نمو ہوجا

بنالے یا تو اپنا جزوِ ایماں مے پرستی کو
نہیں تو توڑ کر جام و سبو سرمستِ ہو، ہوجا

تلاشِ منزلِ مقصود میں بیچارگی کب تک
گرفتارِ علائق لذتِ آوارگی کب تک

ہجومِ حسرت و حرماں سے کیوں ہے اتنی حیرانی
پئے جمعیّت خاطر ہے یہ ساری پریشانی

اگر دنیا میں فکرِ سربلندی ہے تو آگے بڑھ
خیال آرائیوں سے کام لینا بھی ہے نادانی

کہیں عزلت گزینی سے رہِ مقصود ملتی ہے
حصولِ مدعا کے واسطے لازم ہے قربانی
کمرِ ہمت کی کس اور رہ روِ راہِ تجسس ہو
یقیناً رہنمو ہو گی تری تائیدِ ربانی
غبارِ گردِ عبرت ستر پوشی پر ہے آمادہ
تکلف برطرف کس واسطے ہے رنجِ عریانی

خیالِ این وآں میں راستہ کھوٹا نہ کر ہرگز
زمانہ کیا کہے گا اس کی کچھ پروا نہ کر ہرگز

رہے گا موجزن سینے میں کب تک دردِ لاچاری
نگاہِ حسن جو ہے چھین لے ذوقِ پرستاری
فروغِ جلوۂ رنگیں نظر کا ایک دھوکا ہے
خیالاتِ وفا حسنِ تخیل کی گرانباری
امیدِ کامیابی اِک جنونِ خود نمائی ہے
ملالِ ہجر جذباتِ محبت کی تبہ کاری
فریبِ آرزو ہے سب یہ صبر و ضبط کا جھگڑا
حضورِ عشق میں کیسی وفا کیسی وفاداری
مئے اطہر کے بدلے بادۂ انگور کی خواہش
یہ خوں آشامیاں اُف اور اس پر زعم سرشاری

خدا نے عقل دی ہے سوچ کچھ نزدیک و دور اپنا
ارے دیوانے اپنے کام میں لے لاشعور اپنا

۱۹۴۶ء

پھر آنکھ اشک ریز ہے پھر لب پہ آہ ہے
اہلِ نظر کو دعوتِ گوش و نگاہ ہے
طوفانِ گیر و دار میں ہے ورطۂ حیات
جانِ حزیں پہ یورشِ غم بے پناہ ہے
کس سے نظر ملائیے کس سے چرائیے
بُت خانہ اِس طرف ہے اُدھر قتل گاہ ہے
جاروب کش ہوں اُس کا بھی تیرہ سو سال سے
اس سے بھی اس کے بعد سے ہی رسم و راہ ہے
وہ بھی نظر فروز ہے یہ بھی نظر فریب
وہ حُسن ہے یہ حُسن کی اِک جلوہ گاہ ہے
روشن ہے اس کے نام سے بزمِ تجلّیات
شرمندہ اس سے آئینۂ مہر و ماہ ہے
ہر ذرّہ اس کی خاک کا ہے ماہِ مستنیر
ہر پھول اس کے باغ کا جنّت نگاہ ہے
وہ کعبۂ مراد ہے مقصودِ زندگی
یہ مادرِ وطن ہے مری سجدہ گاہ ہے

اس قول پر ہے شاہد عادل مرا ضمیر
اس بول پر مری وطنیّت گواہ ہے

لیکن بایں عقیدت دیرینہ آجکل
وہ اِک مقام ذبح ہے یہ قتل گاہ ہے

دونوں جگہ ہیں میری ہلاکت کے مشورے
دونوں جگہ سکوں ہے نہ حاصل پناہ ہے

وہ سر زمیں کہ تھی مرے حق میں بہشت زار
بربادیٔ تمام کی آماجگاہ ہے

حیرت! کہ آج اس کو نہیں میری جاں عزیز
حسرت! کہ آج اس کو مرے خوں کی چاہ ہے

ناطقؔ خدا بچاتا ہے اب دیکھو کس طرح
منجدھار میں ہوں اور سمندر اتھاہ ہے

8.10.1946

تمنّاءِ برشگال

ہے دورِ آخری میں عہدِ حیاتِ گرما
سورج کی تابشوں سے اک حشر سا ہے برپا
طے ہو چکا ہے جیٹھ اور بیساکھ کا زمانا
ہر شخص کہہ رہا ہے اب جلد آئے برکھا

پورب کی ٹھنڈی ٹھنڈی بھیگی ہوئی ہوائیں
پچھم کی کالی کالی آشفتہ سر گھٹائیں
دیوانہ وار آئیں مستانہ وار آئیں
سرمستیوں کے ساماں کچھ اپنے ساتھ لائیں

عشرت کدوں پہ دھیمی دھیمی پھوار برسے
رندوں کے جھونپڑوں پر کیف و خمار برسے
مینھ آسماں سے برسے اور بے شمار برسے
اب کے برس تو ایسا ابرِ بہار برسے

ہو برق سے نمایاں جوشِ جمالِ تابش
اور رعد کی کڑک سے نغموں کی ہو طراوش
بوندوں کی تازگی سے ہو روح کی فزائش
اس شان سے الٰہی اے کاش آئے بارش

گل پوش ہوں زمینیں گلزار پوش بادل
خوش آب بدرتوں سے بھر جائے سارا جنگل
سبزہ بچھائے آکر فرشِ حریر و مخمل
سقفِ بریں سے برسیں رنگینیاں مسلسل

دیوار و در سے پیدا آئینہ داریاں ہوں
پربت کی چوٹیوں پر فطرت نگاریاں ہوں
شاخوں میں رسّیاں ہوں جھولوں میں سایاں ہوں
اور بھینی بھینی خوشبو کی کیف باریاں ہوں

11-6-1946

نیند

نیند او سرمایۂ عیش و نشاطِ زندگی
او بہارِ زندگی روحِ بساطِ زندگی
تو نہ ہو تو زندگانی مجھ کو ہو جائے وبال
طے نہ آسانی سے ہو ہرگز صراطِ زندگی

قلب پر اک بے خودی سی بن کے چھا جاتی ہے تو
خوابِ شیریں بن کے آنکھوں میں سما جاتی ہے تو
بادۂ پُر کیف کا مجھ کو پلا کر ایک جام
کلفتیں دن بھر کی سب دل سے بھلا جاتی ہے تو

تو نہیں آتی تو میں رہتا ہوں بے حد بے قرار
خون بن کر میری آنکھوں سے ٹپکتا ہے خمار
کروٹیں لیتا ہوں بستر پر تڑپتا ہوں کبھی
اور اُٹھ اُٹھ کر ٹہلتا ہوں کبھی دیوانہ وار

ہو کے ہم آغوش تجھ سے مست ہو جاتا ہوں میں
میٹھی میٹھی لذتوں میں تیری کھو جاتا ہوں میں
کون ہوں کیا ہوں کہاں ہوں کچھ نہیں رہتی خبر
بے خود و مدہوش ہو کر ایسے سو جاتا ہوں میں

22-4-1925

تمنّا

اِک خامشی سی لب پر
اِک بیخودی سی دل میں
کیا چیز ہے یہ شامل
اُف میری آب و گل میں ــــــ کیا چیز ہے یہ شامل ؟
آغازِ شوقِ باطل
انجامِ سعیٔ حاصل
گم کردۂ منازل
کیا چیز ہے یہ شامل
اُف میری آب و گل میں ــــــ برہم زنِ دو عالم ؟
اِک حسرتِ مجسّم
اِک جذبۂ مصمم
بیباک و شوخ برہم
برہم زنِ دو عالم
کیا چیز ہے یہ پنہاں ــــــ میرے دل و جگر میں ؟
ہر عزمِ مستتر میں
ہر جنبشِ نظر میں
سینہ میں اور سر میں

میرے دل و جگر میں
رہتا ہے حشر برپا —— اِک شورش خود آرا ؟
از راہِ ناز و عشوہ
دیتی ہے مجھ کو تڑپا
اِک شورش خود آرا
شاید اسی کو ناطق —— کہتے ہیں سب تمنّا !!

ایک آواز

اپنے عہدِ گذشتہ کی تاریخ ہمدم
جب کبھی مجھ کو پڑھنے کا موقعہ ملا ہے
کیا بتاؤں تجھے اس میں کیا کیا لکھا ہے

ایک بے دست و پا زندگانی لکھی ہے
اک سُلگتی سسکتی جوانی لکھی ہے
ایک مظلوم دل کی کہانی لکھی ہے
جس کو سننے سے انساں کا دل کانپتا ہے

اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ میرے وطن میں
ایک افسردہ دل کے فسردہ چمن میں
صورتِ برق، قلبِ گل و یاسمن میں
شعلۂ غم ہمیشہ بھڑکتا رہا ہے

وہ چمن جس میں کچھ بے نوا بس رہے ہیں
وہ وطن جس میں مجھ سے گدا بس رہے ہیں

ایک غم خانہ ہے غم زدہ بس رہے ہیں
جن سے بندے تو بندے خدا بھی خفا ہے
اور کیا کیا کہوں اس میں کیا کیا لکھا ہے
ایک تصویر کو بھی نمایاں کیا ہے
جس کے ہاتھوں میں کشکول لب پر دعا ہے
مدعا جو مخاطب ہے وہ جانتا ہے

اپنے عہدِ گذشتہ کی تاریخ ہمدم
جب کبھی مجھ کو پڑھنے کا موقعہ ملا ہے
کیا بتاؤں تجھے اس میں کیا کیا لکھا ہے

درشن

کون تھا یہ جو مرے خواب میں آیا تھا ابھی
آ کے چپکے سے مری نیند بھری آنکھوں میں
اپنے آنے کا چمتکار دکھایا کس نے
میری سوئی ہوئی قسمت کو جگایا کس نے
کون تھا یہ جو مرے خواب میں آیا تھا ابھی

کوئی بجلی کسی بجلی کا شرارہ تو نہ تھا
کہیں پاتال سے اُبھرا ہوا پارا تو نہ تھا
"اپسرا" تو کوئی اندر کے اکھاڑے کی نہ تھی
کہکشاں سے کوئی ٹوٹا ہوا تارا تو نہ تھا
کون تھا یہ جو مرے خواب میں آیا تھا ابھی

رُخِ گُل رنگ پہ سورج کی تب و تاب لیے
نرگسی آنکھوں میں کیفِ مئے خوش آب لیے
جیسے گلشن میں کوئی پھول کھلا ہو تازہ
جیسے آکاش میں اِک چاند اُتر آیا ہو
کون تھا یہ جو مرے خواب میں آیا تھا ابھی

ایسے عالم میں کہ مخلوق پڑی سوتی ہے
اور گھٹا چھائی ہے سنسار پہ اندھیاروں کی

جانے کس جذبۂ بیتاب سے ہو کر مجبور
ہاتھ رکھے ہوئے ننھے سے دھڑکتے دل پر
کون تھا یہ جو مرے خواب میں آیا تھا کبھی

مسکراتے ہوئے ہونٹوں پہ مچلتے ہوئے بول
میں نے سمجھا تھا مرے کانوں میں رس گھولیں گے
مگر اک بات بھی اُس شاہدِ زیبا نے نہ کی
کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ معمّہ کیا ہے
کون تھا یہ جو مرے خواب میں آیا تھا ابھی

کیا مجھے جان کے سرمستِ شرابِ پندار
عالمِ ہوش میں لانے کے لیے آیا تھا
یا مرے سامنے رکھنے کو کوئی اور سجھاؤ
میرے "ہردے" کو جگانے کے لیے آیا تھا
کون تھا یہ جو مرے خواب میں آیا تھا ابھی

7-3-1959

شکوہ

سن او حیرت طرازِ جلوۂ نیرنگیٔ عالم
مجھے کہنا ہے تجھ سے آج کچھ از راہِ خودداری
بظاہر یوں تو میں کچھ بھی نہ تھا کچھ بھی نہیں لیکن
ترے ایمار کا اک مظہر ہے میری خلقتِ عاری
ترے جلووں کی تابش سے ہوئی نشوونما میری
ترے نغموں میں مضمر تھا مرا افسونِ بیداری
تری تحریکِ خود بینی حیاتِ مرتعش بن کر
مری خاموش فطرت جزو و کُل پر ہو گئی طاری
ترے ذوقِ طلب نے چٹکیاں لے لے کے پہلو میں
مرے دردِ تمنّا کو دیا درسِ وفاداری
دلِ پر آرزو نے تجھ سے پیمانِ وفا باندھا
جبینِ شوق نے کی تجھ سے تجدیدِ پرستاری
بہارِ روضۂ رضواں کے دروازے کُھلے مجھ پر
ملائک میں مری تقدیس کا سکّہ ہوا جاری
مری عظمت کے افسانے سُنائے حور و غلماں نے
مری تعریف میں کی نادرو پرویں نے گہر باری
بہ ایں اعزاز و عظمت میری اک ادنیٰ سی لغزش پر
نگاہیں تو نے اپنی پھیر لیں مجھ سے خفا ہو کر

کچھ نہ پُوچھ

موسمِ سرما کی یہ رنگیں فضائیں کچھ نہ پوچھ
برف میں ڈوبی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں کچھ نہ پوچھ

ہر طرف بہتا ہوا سا ایک سیلابِ لطیف
ہر طرف بکھری ہوئی سیمیں ردائیں کچھ نہ پوچھ

یاسمینِ صبح کی جیسی نمودِ دلفریب
برقِ کوہِ طور کی جیسی قبائیں کچھ نہ پوچھ

دامنِ لیلائے شب کی مرتعش تابانیاں
نو عروسِ شبنمستاں کی ادائیں کچھ نہ پوچھ

چپّہ چپّہ پر زمیں کے آئینے بکھرے ہوئے
گوشہ گوشہ ذرّے ذرّے کی قبائیں کچھ نہ پوچھ

مرکزِ نور و تجلّی بام و در کی طلعتیں
دولتِ فردوس سے پُر زر خلائیں کچھ نہ پوچھ

خم کدوں پر کیف و مستی کا سماں چھایا ہوا
بتکدوں پر رنگ و رامش کی گھٹائیں کچھ نہ پوچھ

اونچے اونچے کاخ و ایواں پر کرم کی بارشیں
خار و خس کے جھونپڑوں پر سائیں سائیں کچھ نہ پوچھ

اہلِ دولت کا فلک ہم دوش پندار و غرور
بیکسوں کی دل گرفتہ التجائیں کچھ نہ پوچھ

روح مضطر ہے تموج ہے بپا جذبات میں
آج بہہ جاؤں گا میں طوفانِ محسوسات میں

25-9-1940

تضمین

بر غزل جگرؔ مراد آبادی

کچھ لطف و التفات سے شرما کے پی گیا
کچھ برہمی کے خوف سے گھبرا کے پی گیا
پیاسا تھا اشتیاقِ نظر پا کے پی گیا
ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا
لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا

یارانِ ہم مذاق نہ فرمائیں کچھ خیال
پوشیدہ کس سے ہے مری خودداریوں کا حال
اور یہ بھی ہو تو یہ مری فطرت سے تھا محال
پیتا بغیرِ اذن یہ کب تھی مری مجال!
در پردہ چشمِ یار کی شہہ پا کے پی گیا

خم دیکھنا کبھی کبھی پیمانہ دیکھنا!
سوئے فلک کبھی سوئے میخانہ دیکھنا
پھر میکشوں کی سمت حریصانہ دیکھنا
زاہد یہ میری شوخیٔ رندانہ دیکھنا
رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا

پینے سے اجتناب تو مجھ کو بھی تھا مگر
کیا کرتا، بے پئے بھی نہیں تھا کوئی مفر

اے چشمِ التفات، کرم! عفو! درگذر
آزردگیٔ خاطرِ ساقی کو دیکھ کر
مجھ کو یہ شرم آئی کہ گھبرا کے پی گیا

اِک پیرِ مے فروش کے در پر بہ چشمِ تر
کیا جانے کس ترنگ میں کچھ جھوم جھوم کر
ناطقؔ یہ کہہ رہا تھا کل اِک مردِ خوش سیَر
اُس جانِ میکدہ کی قسم بارہا جگرؔ
کل عالمِ بسیط پہ میں چھا کے پی گیا

ترانہ

زندہ باد ہندوستاں۔ پائندہ باد ہندوستاں

اے وطن اے ایشیا کے خطۂ جنت نشاں
اے ہماری جنم بھومی اے ہمارے گلستاں
یہ تری شاداب جھیلیں یہ سُہانی وادیاں
اور یہ ہر سمت ان میں قدرتی چشمے رواں

تیری رفعت تیری شوکت پر ہے ششدر آسماں
زندہ باد ہندوستاں۔ پائندہ باد ہندوستاں

پتّے پتّے سے ترے ثابت کہ تیرہ و تار تو
قطرے قطرے سے ترے ثابت کہ گوہر بار تو
ذرّے ذرے سے ترے ثابت کہ مہر آثار تو
چپّے چپّے سے ترے ثابت کہ خود مختار تو

گوشے گوشے سے ترے ثابت کہ تو جنت نشاں
زندہ باد ہندوستاں۔ پائندہ باد ہندوستاں

تیری آزادی کا لیکر اپنے ہاتھوں میں عَلَم
تیری سیوا کے لیے میدان میں اُترے ہیں ہم
قید کا دھڑکا ہے ہم کو اور نہ زنداں کا الم
موت بھی اب کر نہیں سکتی ہمارے سر کو خم

لے کہاں تک کون لیتا ہے ہمارا امتحاں
زندہ باد ہندوستاں۔ پائندہ باد ہندوستاں

اپنا دم خم اب زمانے کو دکھانا ہے ہمیں
تیرے نام نیک کو اونچا اٹھانا ہے ہمیں

ہم پہ جو ہنستے ہیں اُن کو خوں رُلانا ہے ہمیں
ساری دنیا سے تری عزت کرانا ہے ہمیں
ساری دُنیا میں کریں گے، ہم ترا سکّہ رواں
زندہ باد ہندوستاں۔ پائندہ باد ہندوستاں

غیرتِ قومی ہے سینوں میں ہمارے موجزن
شورش افزا ہے دلوں میں جذبۂ حُبِّ وطن
اے وطن اے وہ کہ سیوک تیرے رام اور لکشمن
تجھ پہ ہم قرباں کریں گے اپنی دولت اپنا دھن
تجھ پہ مٹ کر ہی ملے گی ہم کو عُمرِ جاوداں
زندہ باد ہندوستاں۔ پائندہ باد ہندوستاں

نشّۂ حُبِ وطن سے ہو رہے ہیں چوُر ہم
مذہب و ملت کے جھگڑوں سے ہیں کوسوں دوُر ہم
کیوں نہ سمجھیں تجھ کو اپنا جلوہ گاہِ طور ہم
یاد ہے ہیں نورِ مشرق سے تجھے معموُر ہم
اب کہاں تو اور کہاں مغرب کی ظلمت پاشیاں
زندہ باد ہندوستاں۔ پائندہ باد ہندوستاں

آندھیاں بن بن کے چھا جائیں گے ہم افلاک پر
بجلیاں بن بن کے کوندیں گے فرازِ خاک پر
طائرِ آزاد کے مانند ہم بے باک پر
نغمہ پیرائی کریں گے تیری خاکِ پاک پر
رات دن ہوگا یہی ہم سب کے اب وردِ زباں
زندہ باد ہندوستاں۔ پائندہ باد ہندوستاں

17-12-1937

نغمۂ آزادی

فخر سے اونچا ہے سر بھارت کے ہر انسان کا
آج جشنِ فتح ہے آزاد ہندوستان کا
پتّہ پتّہ گل بداماں، بچّہ بچّہ شادماں
رحمتیں اس رنگ و بو پر شکر اس احسان کا
کاخِ آزادی کے دروازے کھلے ہیں ہر طرف
اب نہ کچھ دشمن کا کھٹکا اب نہ غم دربان کا
مغربی تاریکیوں نے گھیر رکھا تھا جسے
ہے "جواہر لال" فاتح آج اُس میدان کا
ہوں مبارک تجھ کو بھارت ورشس یہ آزادیاں
بول بالا ہو جہاں میں تیری عزّ و شان کا

14-8-1947

۲۶ جنوری

دِلوں کی دولت لُٹا کے مانے سروں کی بھینٹیں چڑھا کے مانے
وطن پرستارِ ہند اپنی وطن پرستی دکھا کے مانے

خیالِ آرائشِ وطن میں نہ پھول دیکھے نہ ہم نے کانٹے
ہماری راہوں میں جو بھی آیا ہٹا کے چھوڑا مٹا کے مانے

زمانہ جو ہم سے چاہتا تھا ہمیں بھی خود جس کی جستجو تھی
وہی تمنائیں لے کے اُٹھے اُنہیں فضاؤں پہ چھا کے مانے

ہزار کٹھنائیوں کے ہوتے ہزار فتنوں کے سر اٹھاتے
ہم اپنی آزادیٔ وطن کو نشانِ منزل بنا کے مانے

سمجھ رکھا تھا دیارِ مغرب کے رہنے والوں نے جن کو ذرّے
وہ گوہرِ تابدار سارے جہان کو جگمگا کے مانے

قدم قدم پر بچھا کے کانٹے خزاں نے چاہا تھا ہم کو روکے
مگر ہم اپنے چمن میں ناطقؔ بہارِ تازہ کو لا کے مانے

25-1-1962

ہندوستاں اپنا

وفورِ شادمانی سے نہ ہو کیوں دل جواں اپنا
کہ اب اپنے تصرف میں ہے گنجِ شادماں اپنا

پیامِ کامرانی دے رہے ہیں صبح کے تارے
مرتب کر رہی ہے شام دل آرا سماں اپنا

اُبھرتی آ رہی ہیں کچھ افق سے عیش کی کرنیں
بدلتا جا رہا ہے رنگ دورِ آسماں اپنا

جدھر دیکھو اُدھر کلیاں کھلی ہیں فتح و نصرت کی
دلہن کا روپ دھارن کر رہا ہے گلستاں اپنا

قفس والے بھی خوش ہیں آشیاں والے بھی خوش دل ہیں
دلوں پر سب کے قبضہ ہے یہاں اپنا وہاں اپنا

ہمالہ پر گڑا ہے جا کے پرچم اپنی عظمت کا
زمانے بھر سے اونچا ہے زمانے میں نشاں اپنا

جہاں کی سربلندی جس کے آگے سر جھکاتی ہے
ہے اُس رفعت کا مالک آجکل ہندوستاں اپنا

5-11-1952

رانا پرتاپ کی تصویر

تیج آنکھوں میں لیے اور بل بھاؤں میں لیے
ویرتا کی شان شاہانہ اداؤں میں لیے
گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ کے آغوش میں
دیش کی سیوا کی مورت اپنی چھاؤں میں لیے

جنگلوں کو روندتا صحرا کو ٹھکراتا ہوا
جذبۂ حبِ وطن کی آگ بھڑکاتا ہوا
دیکھنے والوں کے حق میں لے کے تصویرِ عمل
آندھیوں سے کھیلتا طوفاں سے ٹکراتا ہوا

ہاتھ میں گرزِ گراں ماتھے پہ غصّے کی شکن
شیر صورت شیر سیرت شیر ہمت شیر تن
ملک کی آزادیوں کی فکر میں ڈوبا ہوا
اپنی بربادی پہ نازاں اپنے غم پہ خندہ زن

جانتے ہو کون ہے یہ کس کی یہ تصویر ہے
جس کو سب پرتاپ کہتے ہیں یہی وہ ویر ہے

5-6-1951

مہاتما گاندھی

چڑھا کر بھینٹ ہم پر اپنا تن من اپنی جاں تو نے
عطا کی ملک و ملت کو حیاتِ جاوداں تو نے

جہاں پائے ثباتِ اہلِ خرد کے ڈگمگا جائیں
کیا اُن منزلوں کو طے بصد امن و اماں تو نے

کبھی زنداں سے باہر اور کبھی آغوشِ زنداں میں
سُنایا نغمۂ آزادیٔ ہندوستاں تو نے

سمجھ بیٹھے تھے جن کو لوگ ناہموار و پیچیدہ
اُنہیں راہوں میں ڈھونڈا جادۂ منزل نشاں تو نے

جہاں ناقوس پھونکا جا کے اپنی دیش بھگتی کا
کھڑے ہو کر وہیں دی ایکتا کی بھی اذاں تو نے

کہی جو بات اپنے منہ سے وہ کر کے بھی دکھلا دی
عجب کچھ صادق الاقرار پائی تھی زباں تو نے

رہا گو بیشتر محبوس تو دورِ غلامی میں
مگر دورِ غلامی کی اُڑا دیں دھجیاں تو نے

2-10-1955

قطعات و رباعیات

اپنے سوا کسی پہ بھروسہ کیا تو کیا
دل کو اسیرِ دامِ تمنا کیا تو کیا
احباب کے کرم پہ جئے بھی تو کیا جئے
تنکے جلا جلا کے اُجالا کیا تو کیا
4.9.1943

آلام و مصائب سے پریشاں نہیں ہوتے
تکلیف میں امداد کے خواہاں نہیں ہوتے
جو صاحبِ ہمت ہیں زمانے میں وہ ناطقؔ
مر جاتے ہیں شرمندۂ احساں نہیں ہوتے
10.9.1943

کچھ لوگ خوش آواز ہوا کرتے ہیں
کچھ کہنے کے انداز ہوا کرتے ہیں
یہ وصف نہیں جن میں وہ ناطق کی طرح
اک نغمۂ بے ساز ہوا کرتے ہیں

مجھے بخشی گئی جب دولتِ عشق
تحمّل جس کا اک بارِ گراں ہے
کہا میں نے کہ یہ کیا ہے خدایا
صدا آئی "متاعِ دو جہاں" ہے

رودادِ غمِ دل کی سُنائیں کب تک
خود روئیں عزیزوں کو رلائیں کب تک
اِک گایا ہوا گیت ہے ہستی اپنی
اِس گائے ہوئے گیت کو گائیں کب تک
30.7.1943

پنچھی

نشس اندھیاری جی گھبرائے نیند بلائے نیند نہ آئے
تم بھی چپ ہو میں بھی چپ ہوں کیسے کٹے یہ رات بتاؤ
پنچھی کوئی گیت سناؤ

تم تو اکیلے ڈال پہ بیٹھے جانے کیا کیا سوچ رہے ہو
سوچ بچار سے کیا ہوتا ہے پنچھی کچھ بولو بتراو
پنچھی کوئی گیت سناو

جس کی جوت سے جگ جگمگ ہو جس کو سُن کر من لہرائے
کوئی ایسا راگ الاپو کوئی ایسی راگنی گاؤ
پنچھی کوئی گیت سناؤ

اپنی بپتا مت دُہرانا پر بیتی بھی کچھ نہ سُنانا
ان باتوں میں کیا رکھا ہے ان باتوں کو آگ لگاو
پنچھی کوئی گیت سناؤ

آشا اور نراشا پنچھی کوئی سپنے یوگیہ نہیں ہے
دونوں سپنے دونوں دھوکے دونوں کا ہے ایک سبھاؤ
پنچھی کوئی گیت سناؤ

پیار پریت اور پریم کے قصے دیکھت میٹھے چاکھت کڑوے
ان کی آنچ بھسم کر دے گی اس جوالا کو مت بھڑکاؤ

پنچھی کوئی گیت سناؤ

گیان اگیان میں کیا انتر ہے ہم کیا سمجھیں، ہم کیا جانیں
اس کی لہروں سے مت کھیلو جس ندیا کی پار نہ پاؤ
پنچھی کوئی گیت سناؤ

دیکھو دیکھو وہ پورب سے جھلمل کرتا سورج ابھرا
اب گانے کا سمے نہیں ہے اڑ جاؤ پنچھی اڑ جاؤ

میں جگ کا اپرادھی

میں جگ کا اپرادھی
مجھ سے پیار نہ کرنا
تم کلیوں کا جیون تم کنجوں کی رانی
میں اک لوبھی بھونرا تم مدھ مست جوانی
مجھ سے پیار نہ کرنا
میں جگ کا اپرادھی
مجھ سے پیار نہ کرنا
میں پریم پجاری بن کر جب آؤں تمہارے دوارے
اور تم سے تم کو مانگوں گر کے چرنوں میں تمہارے
تم سویکار نہ کرنا
میں جگ کا اپرادھی
مجھ سے پیار نہ کرنا
جب لوگ سنائیں تم کو میری بپتا کے قصے
منہ پھیر کے تم ہنس دینا اُن متروں اُن پرشوں سے
آنکھیں چار نہ کرنا
میں جگ کا اپرادھی
مجھ سے پیار نہ کرنا